نوآبادیاتی تعلیمی ڈھانچے کا تسلسل

Sanjh Lok Raj

خالی

Sanjh Lok Raj

نوآبادیاتی تعلیمی ڈھانچے کا تسلسل

محمد مسعود خالد

فکری تحریک سانجھ

Sanjh Lok Raj

پرنٹ لائن

Sanjh Lok Raj

فہرست

کتابچہ لکھنے کی غرض و غایت 7

پہلا حصہ

نظری مباحث

انسانی شعور 11

زبان 27

لکھائی 36

تعلیمی نظریے 40

مابعدالطبیعاتی طریقہ 44

موضوعی اور معروضی خیالات 54

جاننے کا سائنسی طریقہ 60

سیکولر تعلیم 68

طبقاتی نظریئے 77

دوسرا حصہ

عملی پہلو

غیر رسمی تعلیم 87

رسمی تعلیم 93

تعلیم کا نوآبادیاتی ڈھانچہ 101

تدریس کا حاکمیتی ماڈل 113

Sanjh Lok Raj

ذریعہ تعلیم 118
نظریہ تعلیم بطور نظریہ سیاست 125
ہمارے تضادات 131
پیداواری نظام تعلیم 137
تعلیمی پالیسیاں (1) 144
تعلیمی پالیسیاں (2) 156
روحانی تعلیم 170

Sanjh Lok Raj

کتابچہ لکھنے کی غرض و غایت

''ہمیں اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ صرف زرعی پیداوار بڑھا کر ہم اپنے GDP کے معیار کو تبدیل نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے ہمیں اپنا ہدف صنعتی ترقی کو مقرر کرنا ہو گا اور سائنس اور ٹیکنالوجی کو اپنی ترقی کا محور بنانا ہو گا تاکہ ہم مغربی ممالک سے مصنوعات تیار کرنے (Manufacturing) کے مختلف شعبوں میں مقابلہ کر سکیں جن میں انجینئرنگ کے آلات، کاریں، صنعتی مشینری، دوا سازی، کمپیوٹر چپس (Computer Chips) دھات سازی اور دیگر استعمال کی اشیاء شامل ہیں۔ صنعتی ترقی کے اس ہدف کو حاصل کرنے کے لیے ہمیں جلد اپنے تعلیمی اداروں کا معیار بلند کرنا ہو گا۔ 21 ویں صدی میں تمام ممالک کی درجہ بندی صنعتی اور معاشی ترقی کی بنیاد پر ہو گی۔''

(ڈاکٹر عطاء الرحمٰن۔ سائنس کی اعلیٰ تعلیم اور پاکستان)

اس میں کوئی شک نہیں کہ ترقی، معاشی خود انحصاری، سیاسی خود مختاری اور آزادی کا راستہ صنعتی ترقی ہی سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہ جانتے ہوئے بھی ہم صنعتی ترقی کی راہ پر قدم نہیں رکھ سکتے کیونکہ ہم کالونیل نظام میں زندگی گزار رہے ہیں۔ کالونیل سسٹم ہے کیا؟ یہ کتابچہ اس سیریز کی چوتھی کڑی ہے۔ جس کا موضوع اگرچہ تعلیم ہے مگر تعلیم کو پورے سماجی ڈھانچے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ کالونیل ازم کو سمجھنے ہی میں اس کا جواب موجود ہے کہ آپ کو تو ایک تالا بنانے کی اجازت نہیں صنعتی ترقی تک کیسے پہنچیں گے۔

کالونیل نظام کے تسلسل کے حامی نظریہ دانوں نے ایسا تاثر قائم کرنے کی کوشش کی ہے جیسے پاکستان 1947ء سے پہلے ایک خالی پلاٹ تھا۔ جس پر قائداعظم اور ان کے رفقاء نے عمارت تعمیر کی ہو۔ نئے سرے سے معیشت کو استوار کیا ہو۔ نیا سیاسی نظام قائم کیا ہو

Sanjh Lok Raj

صنعتی ترقی میں رکاوٹ کے لیے بنائے جانے والے جاگیردار توبہ تائب ہوکر مسلم لیگ میں شامل ہوکر پاکستان میں مسلمانوں کی اجتماعی فلاح کے لیے داخل ہوئے ہوں۔ برطانوی سامراج نے ہندوستان پر قبضے کے دوران معیشت، سیاست، طرزِ حکمرانی اور تعلیمی نظام کی جو بنیادیں رکھیں اسے کالونیل ورثہ کہتے ہیں۔ ان نظریہ دانوں نے اسی کالونیل نظام کے تسلسل کو آزادی کا نام دے کر کالونیل کے لفظ کو ہی نصاب سے غائب کر دیا۔

پاکستان میں بننے والی اب تک کی تمام تعلیمی پالیسیوں کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ تعلیمی پالیسیاں قومی ضرورتوں کے تابع ۔ سیاستدانوں اور فوجی حکمرانوں کی علم سے محبت کے نتیجے میں، لوگوں کو ترقی دینے کے لیے ماہرین تعلیم، ماہرین معاشیات اور سیاسی پارٹیوں کے تھنک ٹینک کے مشورے سے بنائی گئی ہیں جب کہ حقیقت میں یہ پالیسیاں عالمی بنک، عالمی مالیاتی فنڈ اور اقوام متحدہ کے دیگر اداروں نے بنائیں اور ہماری بیوروکریسی نے کبھی فوجی حکمرانوں کے ذریعے کبھی تعلیمی نظام سے لاتعلق سیاستدانوں کے ذریعے لاگو کروائیں۔ یہ پالیسیاں عالمی سرمایہ داری کے بدلتے ہوئے رجحانات کے تابع تبدیل بھی کی جاتی رہیں۔ عالمی سرمایہ داری کی منڈی کو قائم رکھنے کے لیے ہمارے جیسے پوسٹ کالونیل ملکوں میں جس قسم کی معیشت کو نافذ کیا جاتا رہا ایک خاص سیاسی نظام بھی ہمیشہ ایسی معیشت کی حفاظت کے لیے تشکیل دیا جاتا رہا۔ تعلیمی نظام اس سیاسی نظام کا حصہ ہوا کرتا ہے۔ جو سامراجی معیشت کا پاسبان بنایا جاتا ہے۔

یہ کتابچہ انسانی شعور کی ابتداء سے لے کر بولنے اور لکھنا تخلیق کرنے کے عمل تک۔ کائنات کو جاننے کے لیے مابعدالطبیعات سے لے کر سائنس تخلیق کرنے تک۔ تعلیمی نظریات سے لے کر تعلیمی پالیسیوں تک۔ پیداواری نظام تعلیم سے لے کر تعلیم کو بانجھ بنانے والے نظریوں تک کا احاطہ کرنے کی کوشش ہے۔ کتابچے کا دامن اگرچہ کئی دیگر وسیع موضوعات کو سمیٹنے میں کم پڑ گیا ہے مگر پھر بھی تعلیم میں نیولبرل ازم اور گلوبلائزیشن کو سمجھنے میں آپ کی مدد ضرور کرے گا۔

محمد مسعود خالد

Sanjh Lok Raj

پہلا حصہ

نظری مباحث

انسانی شعور

زبان

لکھائی

تعلیمی نظریے

مابعدالطبیعاتی طریقہ

موضوعی اور معروضی خیالات

جاننے کا سائنسی طریقہ

سیکولر تعلیم

طبقاتی نظریۓ

Sanjh Lok Raj

خالی

Sanjh Lok Raj

انسانی شعور

نیوٹن کے بارے میں ایک بہت مشہور واقعہ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ ایک دن وہ کسی درخت کے نیچے بیٹھا تھا کہ درخت سے ایک سیب ٹوٹ کر اس کے قریب آ گرا۔ یہ دیکھ کر نیوٹن اس سوچ میں گم ہو گیا کہ یہ سیب آخر زمین ہی پر کیوں گرا ہے ٹوٹ کر آسمان کی طرف کیوں نہیں اُٹھ گیا۔ سوچتے سوچتے آخر کار وہ اس نتیجہ پر پہنچا کہ زمین ہر مادی چیز کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ بس یہاں تک نہیں نیوٹن نے زمین کی اس طاقت کی ہندسی قیمت بھی دریافت کی اور اسے قانون قدرت کا درجہ حاصل ہو گیا۔

نیوٹن اور اس کے عہد کے لوگوں کو تو اس دریافت کا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ مگر آج آپ کی دنیا جو ایک گلوبل ویلیج بن گئی ہے۔ انٹرنیٹ، موبائل، پوری دنیا کے ٹی وی چینلز آپ گھر بیٹھے دیکھتے ہیں۔ موسمی حالات کی پیش گوئی سنتے ہیں انسان طوفان کی پیش گوئی کر کے انسانی آبادیوں کو سمندری طوفان سے بچانے کی صلاحیت حاصل کر چکا ہے۔ یہ سب کچھ تب ہی ممکن ہوا جب انسان راکٹ اور سیٹلائٹ کو زمین کی کشش کے علاقے سے باہر بھیجنے کے قابل ہوا ہے۔ اگر نیوٹن نے زمین کی کشش کی عددی قیمت دریافت نہ کی ہوتی تو انسان کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہ آتا کہ اس طاقت سے زیادہ طاقت لگا کر سیٹلائٹ کو خلا میں بھیجا جا سکتا ہے۔ اس طرح بظاہر کئی چھوٹی دریافتیں بہت بڑے فائدے کا باعث بنتی ہیں۔

بچپن میں ہم جب چیزوں کے نام سیکھ رہے ہوتے ہیں کہ یہ درخت ہے یہ مکان ہے یہ پرندہ ہے وغیرہ۔ اس وقت ہم نے روح اور شعور کے نام بھی یاد کر لیے ہوئے ہیں۔ اور ساری زندگی ہم روح اور شعور کے بارے میں بنے بنائے نظریات پر زندگی گزار دیتے ہیں۔ ہم روح اور شعور کو بھی درخت اور مکان کی طرح عام سی معمول کی چیز سمجھتے ہیں۔ اور سمجھتے ہیں

Sanjh LokRaj

کہ ان کے بارے میں سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ حالانکہ آج تک کے مذہبی، سیاسی اور سماجی علوم کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم کی جو بلند ترین عمارتیں کھڑی ہیں ان کی بنیاد اس سوال پر ہے کہ روح کیا ہے؟ شعور کیا ہے؟اس سوال کا جواب تلاش کرنے کے لیے ہمیں ہزاروں سال پیچھے جانا پڑے گا۔ جب ابتدائی تصورات جنم لے رہے تھے۔ان تصورات کی بنیاد بنے خواب۔آج ہم جب خواب دیکھتے ہیں تو ہمارے لیے یہ عام سی بات ہے ہم انہیں توجہ کے لائق بھی نہیں سمجھتے بلکہ کچھ خواب تو نیند کے ختم ہونے کے ساتھ ہی ختم ہو جاتے ہیں۔مگر ابتدائی انسان کے لیے یہ خواب کوئی معمولی چیز نہیں تھے۔

ابتدائی انسان جب جنگلوں اور غاروں میں رہا کرتا تھا تو یہ بات اس کے مشاہدے میں آئی تھی کہ وہ خود تو کسی غار کے اندر یا جنگل میں کسی درخت کے تنے کے ساتھ لگ کر سو رہا ہے۔لیکن خواب میں وہ دور دراز جنگلوں میں، پہاڑوں میں، وادیوں میں شکار کھیلتا پھرتا ہے۔ دشمنوں سے لڑتا پھرتا ہے۔ دوستوں سے خوش گپیاں کر رہا ہوتا ہے۔کبھی درندوں سے خود کو بچا رہا ہوتا ہے لیکن خواب سے بیدار ہوتے ہی وہ یہ دیکھ کر حیران ہو جاتا تھا کہ وہ اسی درخت کے تنے کے ساتھ یا غار کے ایک گوشے میں پڑا ہے۔حالانکہ چند لمحے پہلے وہ کہاں کہاں پھر رہا تھا۔آپ بھی اپنے بچپن میں یقیناً ایسی حیرت سے گزرے ہوں گے۔آپ کو بتا دیا جاتا ہے کہ یہ خواب ہے مگر ابتدائی انسان کو بتانے والا کوئی نہیں تھا اور اسنے خود ہی یہ نتیجہ نکال لیا کہ انسان کے جسم میں کوئی ایسی چیز ہے جو سوتے وقت اس کے جسم سے نکل جاتی ہے اور پھر پھرا کر جاگ جانے پر بدن میں واپس آ جاتی ہے۔

پھر ان ابتدائی لوگوں کے مشاہدے میں یہ بات بھی آتی تھی کہ جب کوئی شخص مر جاتا ہے تو سوئے ہوئے انسان کی طرح ہوتا ہے۔بس فرق صرف یہ ہے کہ سونے والا شخص کچھ دیر کے بعد اُٹھ جاتا ہے اور زندگی کے معمولات میں حصہ لینے لگتا ہے۔لیکن مرنے والا شخص کبھی بیدار نہیں ہوتا۔ اس کا جسم گل سڑ جاتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے مشاہدوں کے نتیجے میں وہ یہ قیاس کرنے لگا کہ اس کو زندہ اور متحرک رکھنے والی کوئی ایسی چیز ہے جو جسم سے الگ بھی ہو جاتی ہے۔اگر خواب میں الگ ہو تو واپس آ جاتی ہے اور اگر مرنے پر الگ ہو تو واپس نہیں آتی۔

جسم سے الگ سمجھی جانے والی اس قیاسی چیز کو ابتدائی انسان نے روح کا نام دیا روح کا لفظی مطلب ہے، سانس، ہوا کا جھونکا۔ پھونک۔ اس طرح روح کا تصور انسانی فکر کی پہلی تخلیق ہے۔ تصورات بھی دنیا کی دوسری چیزوں کی طرح ارتقاء پذیر رہتے ہیں۔ روح کا سادہ سا تصور جو خواب کی وجہ سے پیدا ہوا تھا آگے بڑھ کر پیچیدہ سے پیچیدہ شکلیں اختیار کرتا گیا۔ ابتدائی انسان کے مشاہدے میں یہ بھی آتا تھا کہ حالت خواب میں وہ ان لوگوں سے بھی ملتا ہے جو مر چکے ہوتے ہیں۔ وہ ان سے باتیں کرتا ہے۔ ان کے ساتھ شکار کھیلتا ہے۔ بزرگوں کی صحبت میں بیٹھ کر ان سے مشورے کرتا ہے۔ وہ یہ سمجھنے لگا کہ خواب میں وہ جن مرے ہوئے لوگوں سے ملتا ہے دراصل وہ ان کی روحیں ہیں۔ ان کے جسم تو ختم ہو گئے ہیں مگر ان کی روحیں باقی ہیں۔

یہ روحیں سنتی ہیں۔ بولتی ہیں۔ سوچتی سمجھتی ہیں یہ تصور آج بھی ہے۔ حالانکہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ روح جب جسم میں ہوتی ہے تو زبان کے بغیر بول نہیں سکتی۔ کان کے بغیر سن نہیں سکتی۔ آنکھ کے بغیر دیکھ نہیں سکتی۔ دماغ پر چوٹ لگ جائے تو یہی روح یادداشت کھو دیتی ہے۔ مگر جسم سے آزاد ہوتے ہی روح بغیر کان کے سننے لگتی ہے۔ بغیر زبان کے بولنے لگتی ہے۔ بغیر آنکھوں کے دیکھنے لگتی ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ روح کا تصور ان خوابوں ہی کی بنیاد پر کھڑا ہے جو ہمارے آباء واجداد نے دیکھے تھے۔

چند صدیوں میں روح کا یہ تصور کہ انسان کا جسم گل سڑ جاتا ہے مگر روح باقی رہتی ہے۔ مزید پختہ ہوتا گیا۔ یہ بقائے روح کا تصور کہلاتا ہے۔ انسانی خیالات کے آگے بڑھتے ہوئے اس سفر میں یہ تصور قائم ہونا شروع ہو گیا کہ روح اگرچہ ہمیں نظر نہیں آتی مگر وہ ہمیں دیکھتی ہے۔ مشکل میں ہماری مدد کرتی ہے۔ اگر کوئی روح ناراض ہو تو وہ ہمیں کسی مشکل میں پھنسا سکتی ہے۔ اس طرح روحوں کے متعلق اگلا تصور یہ قائم ہوا کہ روحیں نیک اور بد دونوں قسم کی ہوتی ہیں۔

روح کے تصور کے اس قدر پختہ اور مکمل ہو جانے کے بعد انسان نے ناراض روحوں کے شر سے بچنے اور انہیں اپنا تابع فرمان بنانے کا طریقہ کھوج نکالا۔ اس نے کچھ ایسی رسمیں ترتیب دیں جن کے ادا کرنے سے وہ اپنے خیال کے مطابق روحوں کی ناراضگی

Sanjh Lok Raj

میں کمی کر سکتا تھا کچھ دوسری رسمیں نیک روحوں کو خوش کرنے کے لیے ادا کی جانے لگیں تا کہ ان روحوں کو زیادہ مہربان بنا کر فصل۔ بارش اور خوشحالی حاصل کی جائے۔ پھر کچھ سیانے لوگوں نے سمجھ میں نہ آنے والے مہمل الفاظ کو جوڑ کر منتر بنائے جن کو پھونکنے سے ان کے اپنے خیال کے مطابق نیک و بد دونوں قسم کی روحوں کو تابع فرمان کیا جا سکتا تھا۔ یہ دور (Age of Magic) کہلاتا ہے۔

اس طرح انسان نے بالآخر رسموں اور منتروں کے ذریعے ناراض روحوں کی طرف سے کسی مشکل میں پھنسائے جانے کے خوف پر قابو پا لیا۔ مظاہر فطرت کو اپنی مرضی کے تابع کرنے کی انسان کی خواہش کا یہ پہلا عملی اظہار تھا۔ جیسے جیسے وقت آگے بڑھتا گیا انسان کے مشاہدے گہرے اور رنگا رنگ ہوتے گئے۔ انسان نے پہاڑوں سے لڑھکتے پتھروں، دریاؤں میں بہتے پانی۔ زلزلے اور بادل غرضیکہ حرکت کرنے والی ہر چیز کی حرکت کی وجہ اس میں موجود روح کو قرار دیا۔ یہاں تک کہ ہر متحرک چیز کے ساتھ ساتھ جامد، بے جان چیزوں کو بھی ذی روح سمجھا جانے لگا۔ ابتدائی انسان کا خیال تھا کہ کائنات کی ہر شے ہماری طرح سوچتی سمجھتی محسوس کرتی ہے۔ ہماری طرح دوستی اور دشمنی کے جذبات رکھتی ہے۔ اس تصور کو روحوں کا مت (Animism) کہا جاتا ہے۔ روحوں کے مت کی بازگشت آج بھی آپ کو قصے، کہانیوں اور مذہبی واقعات میں ملے گی جیسے پتھر کا بول پڑنا۔ سانپ کا بدلہ لینے کے لیے پیچھا کرنا۔ آسمانی بجلی کا کسی خاص شخص کو تلاش کر کے اس پر گرنا وغیرہ۔

زراعت کا راز معلوم ہو جانے کے بعد انسان نے بجائے اکٹھی کرنے کے خوارک خود پیدا کرنی شروع کر دی۔ خانہ بدوشی چھوڑ کر بستیاں آباد کیں۔ زراعت نے اسے مستقل سکونت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس طرح انسان کو فرصت کے لمحات میسر آئے تو انسان نے مظاہر فطرت۔ کائنات اور انسان کے درمیان تعلقات کے تصورات کو از سر نو ترتیب دیا۔ بہت سے سوالوں کے جواب تلاش کرنے کی کوشش کی اور بکھرے ہوئے خیالات کو باقاعدہ شکل دینے کی کوشش کی۔

روح انسان کے جسم سے نکل کر آخر کہاں جاتی ہے؟ اس کے مرے ہوئے بزرگ رشتہ دار جو اسے خواب میں آ کر ملتے ہیں وہ آخر کہاں رہتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

اب ظاہر ہے کہ روح کا جسم سے الگ وجود مانا جانا اور جسم کو گلنے سڑنے والی چیز اور روح کو لافانی چیز تصور کرنے کے بعد دو دنیاؤں کا تصور پیدا ہونا لازمی تھا۔ ایک ظاہری دنیا جس میں ہم رہ رہے ہیں اور ایک باطنی دنیا جس میں روحیں رہتی ہیں۔ پھر یہ سوال ابھرا کہ اگر روح لافانی ہے تو یہ پیدا نہیں ہوئی ہوگی کیونکہ پیدا ہونے والی چیز کو آخر مرنا ہے۔ اس کا سادہ سا جواب تھا کہ روح لافانی ہے۔ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گی۔

زندگی اور موت تو جسم کو ہے۔ روح عالم باطن سے آتی ہے اور وہیں لوٹ جاتی ہے۔ اس طرح روح۔ بقائے روح اور دو دنیاؤں کے تصورات بالآخر ایک نظامِ فکر کی شکل اختیار کرنے لگے۔ ان تصورات کو یہاں تک پہنچتے صدیاں لگ گئیں بالآخر افلاطون نے ان تصورات کو اکٹھا کر کے تمام مفروضوں کو ایک منظّم نظریئے کی شکل دی جس کو مثالیت کا نظریہ (Idealism) کہا جاتا ہے۔

مثالیت کے نظریئے کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایئے کہ دنیا کے تمام تر مذاہب کی بلند و بالا عمارتیں مثالیت کے نظریئے کی بنیادوں پر کھڑی ہیں۔ مثالیت کو سمجھنے کے لیے ایک سنگ تراش کی مثال لیجیے جو سنگ مرمر کے ٹکڑے سے ایک گھوڑا بناتا ہے۔ ظاہر ہے گھوڑے کا تخیل یا آئیڈیا سنگ تراش کے ذہن میں موجود تھا جس کی مثل یا ہو بہو اس نے سنگ مرمر پر ثبت کر دی جس سے سنگ مرمر کا گھوڑا وجود میں آ گیا۔ اس کہانی میں تین چیزوں کا ذکر ہے۔ (1) سنگ تراش (2) تخیل یا آئیڈیا جس کی مثل سنگ مرمر پر ثبت کی گئی (3) سنگ مرمر کا گھوڑا۔

افلاطون کے نزدیک سنگ تراش اس کہانی میں اضافی ہے۔ اگر ہم سنگ تراش کو نکال دیں تو دو چیزیں باقی رہ جاتی ہیں۔ (1) آئیڈیا یعنی تخیل جس کی مثل ثبت کی گئی (2) سنگ مرمر کا گھوڑا۔

افلاطون کا قیاس ہے کہ سنگ مرمر کا گھوڑا ہماری ظاہری دنیا ہے جس میں ہم موجود ہیں اور تخیل یا آئیڈیا جس کی مثل ہماری یہ ظاہری دنیا ہے وہ عالم باطن ہے۔ باطنی دنیا میں لاتعداد آئیڈیا موجود ہیں جو اپنی مثل ثبت کرتے رہتے ہیں اور ہماری ظاہری دنیا کو وجود میں لاتے رہتے ہیں۔ انہی تخیل یا آئیڈیاز کو جن کی مثل ظاہری دنیا کی لاتعداد چیزیں وجود میں آتی ہیں افلاطون نے امثال کا نام دیا ہے۔ یعنی تخیل یا آئیڈیا کو ہی امثال کہا ہے۔

Sanjh Lok Raj

افلاطون کی امثال لاتعداد ہیں۔ خیر۔ صداقت۔ جن کے علاوہ شر، بدصورتی اور خباثت بھی امثال ہیں۔ عالم امثال مادی دنیا سے ماوراء ہے۔ امثال ازلی اور ابدی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ ظاہر کی دنیا میں ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے محض دھوکا ہے۔ یہ عالم امثال کی پرچھائیاں ہیں۔ انہی امثال کی وجہ سے افلاطون کا نظریہ ''مثالیت'' کہلاتا ہے۔ یہاں یہ بات دوبارہ سمجھنا لازمی ہے کہ افلاطون کی امثال وہ آزاد تخیلات یا آئیڈیا ہیں جو اپنا آزاد وجود رکھتے ہیں۔ یعنی ان تخیلات کے پیدا ہونے کے لیے کسی دماغ کی ضرورت نہیں۔ یہ امثال از خود موجود ہیں۔ ازلی ہیں مستقل ہیں۔ افلاطون کی لا تعداد امثال میں خیر مطلق یا خدا کی بھی ایک مثل ہے جو فکر محض ہے۔

افلاطون کے نظریہ مثالیت سے متفق لوگوں نے باطنی دنیا سے متعلق اپنی اپنی تصوراتی معلومات اور قیاسات کو اکٹھا کر کے اسے علم کی ایک باقاعدہ شاخ قرار دے دیا جسے ماورائیت کہتے ہیں۔ ارسطو نے اس میں کچھ اضافے کر کے اسے مابعد الطبیعات کا نام دیا۔ افلاطون کے زمانے ہی کے کچھ لوگ مثالیت کے نظریے سے متفق نہیں تھے۔ وہ یہ دیکھتے تھے کہ ماورائیت کو ماننے والے باطنی دنیا کے الگ الگ نقشے پیش کرتے ہیں اور وہ آپس میں ہی ایک دوسرے سے متفق نہیں ہیں اور نہ ہر شخص کے بس کی بات ہے کہ وہ خود باطنی دنیا کا مشاہدہ کرے۔ اس لیے باطنی دنیا سے متعلق جو قیاس آرائیاں کی جاتی تھیں انہیں معلومات نہیں سمجھتے تھے۔ ماورائیت کو ماننے والوں کے آپس میں متفق نہ ہونے اور ان کی تصوراتی معلومات کے قابل مشاہدہ نہ ہونے کی وجہ سے ان لوگوں نے مثالیت کا نظریہ مسترد کر دیا۔

آپ کو یاد ہوگا کہ افلاطون نے کہا تھا کہ آئیڈیا یعنی امثال اپنا آزاد وجود رکھتی ہیں اور وہ اپنے وجود کے لیے کسی مادی چیز کے محتاج نہیں۔ مثالیت کو مسترد کرنے والے لوگوں کا خیال تھا کہ آئیڈیا، امثال یا تصورات اپنا وجود مادی دماغ کے بغیر قائم نہیں رکھ سکتے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے ہم ایک مثال پر غور کرتے ہیں۔ یہ مثال ہے جلتی ہوئی موم بتی کی۔ اگر آپ جلتی ہوئی موم بتی کے شعلے کو الگ کر کے دیکھیں تو شعلے کا وجود قائم نہیں رہے گا۔ کیونکہ شعلہ تو ہے ہی موم کا دھاگے کے ذریعے جلنے کا نام۔ یعنی شعلہ جلنے کے عمل کا نام ہے۔ شعلے کو الگ کرنا جلنے کے عمل کو روکنا شعلے کی موت ہے۔ ماورائیت کے مخالف یہ سمجھتے تھے کہ تخیلات،

تصورات یا افکار انسانی دماغ کا عمل ہے۔ ان کا وجود دماغ سے انہیں الگ کر کے قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ یعنی دماغ ہوگا تو آئیڈیا بھی ہوگا اس طرح ان لوگوں نے مادے کی اوّلیت کو تسلیم کیا۔

آپ کو یہ بھی یاد ہوگا کہ افلاطون نے کہا تھا کہ یہ جو ظاہری دنیا چل رہی ہے یہ ایک ریموٹ کنٹرول سے چلنے والے کھلونے کی مانند ہے۔ جس کا کنٹرول باطنی دنیا میں ہے اس طرح مثالیت کے اس طرز فکر میں ظاہری دنیا کی تمام حقیقتوں کو ماورائیت کے آئینے میں دیکھا جانے لگا۔ زمین بنجر ہے تو باطنی دنیا کی وجہ سے۔ زلزلہ آ گیا ہے تو باطنی دنیا میں اس کے اسباب تلاش کرو۔ بیماری آ گئی ہے تو اوپر سے۔

مثالیت، ماورائیت اور مابعدالطبیعات کو نہ ماننے والوں نے سوچنے کے ایک نئے ڈھنگ کا آغاز کیا۔ انہوں نے اپنے اردگرد کی ظاہری دنیا کو ایک حقیقت یا حقیقی دنیا تسلیم کر لیا کیونکہ اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا تھا۔ اسے مادے کا نام دیا۔ اپنے اردگرد میں دنیا کے وجود کا جوہر تلاش کرنے کی کوشش کی۔ اس سے ایک نئے علم کی بنیاد رکھی گئی جسے فلسفہ کہتے ہیں۔ کیونکہ مادے کو حقیقی وجود مان کر اس علم کا آغاز ہوا۔ اس لیے اس کو فلسفہ مادیت کہتے ہیں۔

اس بات کو دھیان میں رکھنا ضروری ہے کہ مثالیت ایک نظریہ ہے اور مادیت ایک فلسفہ نظریئے اور فلسفے کے فرق کی وضاحت مثالوں سے ہوگی۔

مادیت کا طرز فکر یہ ہے کہ زلزلہ کیوں آتا ہے؟ تو اس کی وجہ زمین کی ساخت میں اس کے اندر ہونے والے فطری عوامل میں تلاش کرو۔ زمین زرخیز کیوں نہیں ہے؟ فلسفہ کا طرز عمل یہ ہے کہ اس کے بنجر ہونے کی وجوہات زمین کے اندر ہی مختلف کیمیائی مادروں کی کمی بیشی میں تلاش کرو۔

حکیم بقراط نے کہا کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ’’مرگی بھی دوسری بیماریوں کی طرح آسمان سے نازل نہیں ہوئی۔ اس کے اسباب بھی اتنے ہی مادی ہیں جتنے دوسری بیماریوں کے۔ انسان اس کو اس لیے مافوق الفطرت سمجھتے ہیں کیونکہ وہ ان کے اسباب نہیں جانتے لیکن اگر وہ ہر اس شے کو مافوق الفطرت سمجھنے لگیں جن کے بارے میں وہ نہیں جانتے تو اس طرح تو ان چیزوں کا شمار ہی نہیں ہوگا۔‘‘

اس طرح فلسفہ اور علم کی شروعات عالم بالا سے لاتعلقی سے ہوئیں۔ انسان نے

Sanjh Lok Raj

زمین کے ساتھ رشتہ جوڑ کر کائناتی سماجی اور معاشی حقیقتوں، ان میں ہونے والے تغیر و تبدل اوران کی فعالیت کوان کے اندرون ہی میں تلاش کرنے کا آغاز کیا۔

یہاں انسان کے ابتدائی افکار کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ انسان نے شروع ہی سے سوچنے کے دو طرح کے طریقے اپنائے ہیں۔ دونوں طریقے ایک دوسرے کے متضاد مگر تاریخ میں برابر چلے آ رہے ہیں۔ دریا کے دو کناروں کی طرح ایک دوسرے کے متوازی چلے آ رہے ہیں۔ ایک طریقہ مثالیت، ماورائیت اور مابعدالطبیعات کا ہے اور دوسرا طریقہ مادیت، فلسفے اور عقل کا ہے۔

انسانی شعور کے بارے میں ان دونوں طریقوں سے خود انسان نے کیا سوچا؟ بقائے روح کا تصور چونکہ اپنے مرے ہوئے بزرگوں کی خواب میں ملاقات سے اخذ کیا گیا تھا اور یہ بزرگ چلتے پھرتے۔ باتیں کرتے۔ سوچتے سمجھتے۔ پیار محبت کرتے یا دشمنی نبھاتے ہوئے ملتے تھے اور یہ سمجھا جاتا تھا کہ یہ ان بزرگوں کی روحیں ہیں جو خواب میں آ کر ملتی ہیں تو مثالیت کے نظریہ پر یقین رکھنے والے لوگ انسانی شعور، زبان و بیان، لکھائی پڑھائی اور جذبات کو روح کا لازمی حصہ تصور کرتے تھے روح ظاہر ہے کہ عالم بالا سے نسبت رکھتی تھی اس لیے تعلیم اور شعور کے بارے میں افلاطون کے الفاظ سُن لیجیے۔

''مادی پیکر میں آنے سے پہلے روح بھی عالم باطن میں تھی۔ ظاہری دنیا میں آ کر روح میں باطنی دنیا کی دھندلی سے یاد باقی رہ جاتی ہے تعلیم کا مقصد یہ ہے کہ روح کے اس حافظے کو تقویت دی جائے تا کہ وہ روح حقیقی کو پہچان سکے۔''

مثالیت پر یقین رکھنے والے تو ہر مسئلہ عالم باطن سے جوڑ کر اپنے دماغ پر سوچنے کا بوجھ نہیں پڑنے دیتے۔ مگر مادیت پر یقین رکھنے والے دوسری طرح سے سوچتے ہیں اور جوں جوں کائناتی حقائق ان پر کھلتے جاتے ہیں وہ حقیقت کی قریب سے قریب تر ہوتے جاتے ہیں شروع سے اب تک انسان نے شعور کے بارے میں کیا کیا سوچا اور آخر کار کیا حقیقت سامنے آئی؟

یہ بات تو ہر شخص کے مشاہدے میں آتی ہے کہ جب تک روح اس کے جسم میں ہے اس کا دل دھڑکتا رہتا ہے۔ دل کی دھڑکن کے بند ہونے پر سمجھ لیا جاتا ہے کہ روح اس کے جسم سے پرواز کر گئی ہے۔ پھر دھڑکن کے بند ہونے کے ساتھ ہی سانس ختم۔ بولنا چلنا،

Sanjh Lok Raj

عقل وشعور۔ جان پہچان کا عمل ختم ہو جاتا ہے اس لیے یہ سمجھا جانے لگا کہ یہ سب کچھ روح کے ساتھ ہی ختم ہو گیا یا چلا گیا۔ اس وقت تک ابھی انسان کو یہ پتہ نہیں چلا تھا کہ سر پر چوٹ لگنے سے اگر کوئی شخص بے ہوش ہو جاتا ہے تو روح تو اس کے اندر موجود ہوتی ہے مگر عقل و شعور، بولنا چلنا اور جان پہچان ختم ہو جاتی ہے۔ اب تک وہ دل کو ہی تمام فکری و جذباتی سرگرمیوں کا مرکز سمجھتے تھے۔ سوچنے سمجھنے کے عمل کو دل ہی سے منسوب کرتے تھے۔

آج بھی آپ اپنے اردگرد ہونے والی گفتگو میں سنتے ہیں۔ یونہی میرے دل میں خیال آیا تو میں آپ کی طرف چلا آیا۔ ایک دل تو چاہتا ہے کہ ایسا کرلوں مگر ایک دل چاہتا ہے کہ ایسا نہ کروں۔ آپ کی ہر بات میرے دل پر نقش ہے۔ ہمارے زمانے میں تو ایک گانا بھی بہت مشہور تھا ''کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے۔''

یہ محاورے جو ہم روزمرہ زندگی میں استعمال کرتے ہیں ظاہر ہے ہمارے آباءواجداد نے بنائے ہیں محاورے اس زمانے کے لوگوں کے خیالات کی عکاسی کرتے ہیں جس زمانے میں یہ محاورے بنائے گئے ہوتے ہیں۔ دنیا بڑی تیزی سے بدلتی رہتی ہے مگر اس تبدیلی کا اثر ثقافت، زبان اور محاوروں پر ذرا دیر سے ہوتا ہے۔ اوپر والی گفتگو سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ہمارے آباءواجداد دل ہی کو سوچنے سمجھنے والی کوئی چیز مانتے تھے۔ دل ہی کو فہم وادراک، شعور وخیالات کا مرکز جانتے تھے۔ اور دل کو برے خیالات سے پاک کرنے کی تطہیرِ قلب کی باتیں کرتے تھے۔

پھر اس میں ایک اور تبدیلی آئی۔ دل چونکہ سینے میں ہوتا ہے اس وجہ سے سینے کو بھی علم اور خیالات وشعور کے ساتھ ایک نسبت ٹھہری۔ فلاں عالم کا سینہ علم کا خزانہ تھا۔ قرآن کریم کو حفاظ کرام نے سینوں میں محفوظ کرلیا۔ سینے کو علم کے نور سے منور کرنے کی دعائیں۔ سینہ کھولنے کی دعائیں بھی آپ کے لیے آپ کے والدین نے بچپن میں ضرور کروائی ہوں گی۔ ''شرح صدر'' کا واقعہ بھی آپ نے سنا ہوگا۔

سینے میں موجود علم جو روح عالم باطن سے اپنے ساتھ لائی تھی ان پر پردے پڑے ہوتے ہیں جنھیں حجابات کہا جاتا ہے۔ کچھ دعائیں، کچھ مذہبی رسمیں اور ریاضت کے چند مخصوص طریقے اختیار کرنے سے یہ حجابات دور ہو جاتے ہیں اور کائنات کے تمام راز انسان

کے دل پر منکشف ہو جاتے ہیں۔

یعنی اس وقت تک بھی مثالیت ہی غالب ہے۔ دل کا ظاہری اور باطنی علوم کے نور سے منور ہونا ان سب باتوں سے یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ ہمارے آباء واجداد دل ہی کو خیالات کا مرکز سمجھتے تھے۔

مگر آج تو ایک بچہ بھی یہ جانتا ہے کہ دل تو جسم میں خون دوڑانے والا ایک پمپ ہے اور یہ کہ خیالات کا مرکز دماغ ہے۔ سوچنا سمجھنا، فہم و ادراک، یاد داشت دماغ کا عمل ہے۔ اسی کو عقل کہتے ہیں۔

مادیت پر یقین رکھنے والے یہ سوچتے تھے کہ اگر انسانی شعور اور علم کا تعلق روح سے ہوتا تو ایک بچے اور ایک بوڑھے کا علم وشعور برابر ہونا چاہیے تھا کہ کیونکہ دنیا کی تمام روحیں تو ایک ہی عمر کی ہیں۔ عمر کا تعلق انسان کے جسم سے ہے روح سے نہیں۔ فلسفہ پر یقین رکھنے والے یہ بھی سوچتے تھے کہ علم وشعور کا تعلق اگر روح سے ہوتا تو پتھر کے اوزاروں سے شکار کرنے والے انسانوں کے پاس وہی علوم ہوتے جو آج کے خلا میں سفر کرنے والے انسان کے پاس ہیں۔ کیونکہ زمانے کی قید بھی جسم سے ہے روح سے نہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ پتھر کے زمانے کے لوگوں کے پاس وہ علوم ونظریات نہیں تھے جو کانسی کے زمانے کے لوگوں کے پاس تھے۔ کانسی کے زمانے کے لوگ عقل وشعور کے لحاظ سے پتھر کے زمانے کے لوگوں کی نسبت ترقی یافتہ تھے۔ اس طرح سولھویں صدی کے لوگ کانسی کے زمانے کے لوگوں کی نسبت زیادہ باشعور تھے ارتقاء کا ہونا۔ انسانی علم وآگہی کا بتدریج آگے بڑھنا۔ شعور میں درجہ بدرجہ ترقی۔ ایک نسل اپنی زندگی کے تجربات جہاں ختم کرتی تھی اگلی نسل کا وہاں سے شروع کر کے آگے بڑھنا۔ ایک دریافت کا دوسری دریافتوں کے لیے مددگار بننا یہ سب باتیں ایک ہی حقیقت کا پتہ دیتی ہیں کہ انسان نے اپنی محنت اور کوششوں سے یہ مقام حاصل کیا ہے۔

انسانی شعور کے بارے میں بنیادی باتوں کا پتہ نہ ہونے کی وجہ سے ہم نے زیادہ تر اپنی رائے قصے کہانیوں اور من گھڑت واقعات سے بنائی ہوتی ہے۔ ایسے واقعات میں کوئی مقدس ہستی پیدا ہوتے ہی لوگوں کے سوالوں کا جواب دینے لگتی ہے۔ ایسی کہانیوں میں

Sanjh Lok Raj

پرندے اور جانور باتیں کر رہے ہوتے ہیں۔ اس طرح کی باتیں جب ہمارے ذہن کے کسی گوشے میں موجود ہوتی ہیں اور ہم نے انہیں سچ تسلیم کر لیا ہوتا ہے تو ہم پہلے سے موجود ان خیالات کی بنیاد پر ثابت شدہ سائنسی حقائق کی بھی جھٹلا دیتے ہیں۔

اب ہم بیالوجیکل دریافتوں کی طرف نظر دوڑاتے ہیں۔ بیالوجیکل سائنسز کی جدید دریافتوں کے مطابق خیالات، حافظہ، تجزیہ کرنے کی صلاحیت، زبان و ابلاغ سب دماغ کا عمل ہے۔مگر کیا سوچ سمجھ اور زبان کے لیے صرف دماغ کا ہونا ہی کافی ہے؟ تو جواب ہے نہیں۔ کیونکہ دماغ خیالات کو اپنے اندر سے اس طرح پیدا نہیں کرتا جس طرح سورج روشنی اور گرمی پیدا کرتا ہے۔ اگر دماغ ہی کافی ہوتا تو وہیل مچھلی سب سے آگے ہوتی کیونکہ وہیل مچھلی کا دماغ انسانی دماغ سے کہیں بڑا ہوتا ہے۔ دماغ کے پاس بیرونی دنیا سے معلومات حاصل کرنے کے لیے آلات ہیں۔جنھیں ہم حواس کہتے ہیں۔ اگر پانچوں حواس کام بند کر دیں تو دماغ کی سکرین پر سوائے اندھیرے کے کچھ نہ ہو۔

آپریشن کے لیے جب مریض کو بے حس کیا جاتا ہے تو اس دوران خواہ اس کے جسم کا کوئی عضو کاٹ دیا جائے تو اسے پتہ نہیں چلتا۔ بے حس اور بے جان چیز میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔اگر انسان کو مسلسل بے حس رکھا جائے تو بیرونی دنیا سے اس کا رابطہ منقطع ہو جائے گا۔کبھی کبھار بڑھاپے کے باعث یا سر پر چوٹ لگنے کی وجہ سے کچھ لوگ اپنی یادداشت کھو دیتے ہیں۔ ایسی صورت میں ان کے حواس تو کام کرتے ہیں۔مگر دماغ کام نہیں کر رہا ہوتا۔انہیں باہوش لوگوں میں شمار نہیں کیا جاتا۔اس لیے جب بھی دماغ کا ذکر ہو تو حواس اس کا لازمی حصہ ہیں۔ اگر آپ کسی اندھے کو نیلا رنگ سمجھانا چاہیں تو کیسے سمجھائیں گے؟ یعنی علم کی بنیاد بھی حواس ہی ہیں۔لیکن یہ بات یہاں پر ختم نہیں ہو جاتی۔شعور کے لیے دماغ اور اس کے آلات کا ہونا ہی کافی نہیں۔اگر ایسا ہوتا تو انسان جانوروں کی طرح فطرت کا غلام ہی رہتا۔

فطرت کا غلام ہونے اور فطرت پر قابو پانے کا بنیادی فرق ہی جانور اور انسان کا فرق ہے پیدائش کے وقت ایک حیوانی بچہ ایک اعتبار سے انسانی بچے پر فوقیت رکھتا ہے۔ زندگی کی طبعی ضرورتوں کے متعلق حیوانی بچے کے اندر ہدایات از خود موجود ہوتی ہیں۔ یہ ہدایات دراصل وہ عادتیں ہیں جو بے شمار نسلوں اور ہزاروں سال کے دوران زندگی کی جدوجہد میں

Sanjh Lok Raj

پیدا ہوئیں اور اگلی نسلوں کو منتقل ہوئیں۔ انہیں جبلت کہا جاتا ہے یعنی (instincts) جبلت بھی ایک طرح سے فطرت کی غلامی ہے۔ جبکہ عقل وشعور اس سے کہیں آگے کی بات ہے۔ مثال کے طور پر ایک مرغی کے نیچے بطخ اور مرغی کے انڈے ملا کر رکھ دیں تا کہ بچے نکل آئیں ایک مقررہ وقت کے بعد جب ان سے چوزے نکلیں گے تو بطخ کے بچے فوری طور پر پانی کی طرف لپکیں گے۔ پانی میں تیرتے ہوئے انہیں دیکھ کر آپ کو ایسا لگے گا کہ انھوں نے تیرنا کہیں سے سیکھا ہے۔ جو اتنی مہارت سے تیر رہے ہیں۔ مرغی کے بچے کے پاؤں کو اگر پانی چھو جائے گا تو وہ ناپسندیدگی کے اظہار کے ساتھ گیلی جگہ کو چھوڑ دے گا۔ مرغی کے بچے پر اگر چیل کا سایہ پڑ جائے تو وہ بھاگ کر اپنی ماں کے پروں میں دبک کر بیٹھ جائے گا۔ اس طرح کئی پرندے جب اپنا گھونسلہ بنتے ہیں تو لگتا ہے جیسے کسی جگہ سے سیکھ کر آئے ہیں اور کبھی تو ایسا بھی لگتا ہے جیسے یہ ایک شعوری کوشش ہے۔ لیکن یہ ان کی نوعی خصوصیات ہیں جنھیں جبلت کہا جاتا ہے۔

انسانی شعور کا معاملہ تو اس سے بہت آگے ہے۔ انسان تو قدرت کو اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں۔ تو پھر سوال یہ ہے کہ دماغ، حواس اور جبلت سے آگے کا مرحلہ کیا ہے؟ جن کو ہم صحیح طور پر شعور کہہ سکتے ہیں۔ جدید بائیالوجیکل سائنسز کے مطابق وہ دماغ، حواس، جبلتوں کے ساتھ پیداواری عمل میں انسانی ہاتھوں سے کی گئی محنت ہے جس کے دوران انسانی عقل وشعور کی تخلیق ہوئی۔ اس عمل کو ہم ایک خاکے کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ماحول حواس دماغ پیداوار کے لیے محنت تخلیق

اس فارمولے کو الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے۔

انسان نے پہاڑوں سے لڑھکتے ہوئے پتھروں کو دیکھا کہ گول پتھر کسی چپٹے پتھر کی نسبت جلد زمین پر آتا ہے۔ اس مشاہدے کے بعد اس نے اپنے ہاتھوں کی محنت سے کسی چپٹے پتھر کو تراش کر پہیہ تخلیق کیا۔ پیداوار کے اس عمل کے دوران اس کے دماغ میں چند نئے خلیات نے جنم لیا۔

شکار کے دوران انسان نے مشاہدہ کیا کہ نوکدار پتھر کسی چپٹے پتھر کی نسبت شکار کے جسم میں جلدی دھنس کر شکار کو گرا دیتا ہے۔ اس مشاہدے کے بعد جب انسان نے ایک

Sanjh Lok Raj

چوڑے چپٹے پتھر کو اپنے ہاتھوں کی محنت سے تراش کر شکار کا آلہ بنایا تو آلہ کی پیداوار کے اس عمل کے دوران اس کے دماغ میں نئے خلیات نے جنم لیا۔ یہی خلیے بڑھتے گئے اور آج راکٹ اور انٹرنیٹ کی تخلیق تک آ گئے۔ اس طرح اپنی روز کی بڑھتی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے انسان نئی نئی اشیاء تخلیق کرتا گیا۔ اپنے ارد گرد دنیا کو اپنی ضرورتوں کے مطابق ڈھالتا گیا اس طرح وہ عقل و شعور کا مالک بن گیا۔

انسانی شعور کی انسان کے اپنے ہاتھوں تخلیق کے بارے میں گفتگو سے آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ سارا بیان عقلی طور پر لگائے جانے والے اندازوں پر مشتمل ہے۔ ایک بات یاد رکھیے کہ علم کی دنیا میں عقلی اندازوں سے حاصل کیا گیا علم عقلیت پسندی (Rationalism) کہلاتا ہے۔ عقلیت پسندی کا یہ نظریہ بھی مثالیت ہی کے نظریئے کا لازمی جزو ہے۔ اس کی رو سے عقل محض کو (تجربہ و مشاہدہ کی وساطت کے بغیر) حقیقت تک پہنچنے کا اہل سمجھا جاتا ہے۔ افلاطون نے کہا تھا کہ کائنات ایک عقلیاتی کل ہے اور حقیقت تک پہنچنے کے لیے عقلی اندازے ہی کافی ہیں۔ جس طرح کہ مثالیت کا نظریہ بھی امثال کے متعلق ایک عقلی اندازہ ہی ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے ہم عقلیت پسندی کے نقص کو سمجھتے ہیں تاکہ پھر حقیقت تک پہنچنے کا درست طریقہ اختیار کرنے میں مدد ملے۔ آپ نے اپنے ارد گرد ذیابیطس کے کسی مریض کو اگر دیکھا ہو تو لوگوں کو اسے مشورہ دیتے ہوئے ضرور سنا ہوگا کہ کریلے کا پانی نچوڑ کر پی لو آپ کی شوگر ٹھیک ہو جائے گی۔ یہ علاج عقلیت پسندی کے اصول کے مطابق بالکل صحیح ہے اور اس کے پیچھے معقولیت یہ ہے کہ شوگر چونکہ میٹھا کھانے سے ہوتی ہے۔ تو کڑوی چیز کھانے سے اس کو ٹھیک ہو جانا چاہیے۔ عقلی اندازہ تو درست ہے مگر شوگر کا مریض بے چارہ کریلے کا پانی پی کر معدہ بھی خراب کر بیٹھتا ہے۔

مادیت کا علم عقلیت پسندی کو مسترد کرتا ہے وہ کسی بھی عقلی اندازے کو غلط یا درست کہنے کے لیے تجربی تصدیق مانگتا ہے۔ علم کی دنیا میں تجربی تصدیق کو (Empiricism) کہتے ہیں۔

یہاں تجربی تصدیق کو سمجھے بغیر ہمیں آگے نہیں بڑھنا چاہیے کیونکہ عقلی اندازوں کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار تجربی تصدیق ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ یہ بات تو ہر

Sanjh Lok Raj

انسان کے مشاہدے میں آتی ہے کہ لکڑی پانی پر تیرتی ہے اور لوہا پانی میں ڈوب جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ اس کا جواب تلاش کرنے والوں نے اس کی وجہ ڈھونڈ نکالی وہ یہ کہ پانی کے حجم کے مساوی اگر لکڑی کا کوئی ٹکڑا لیں تو لکڑی اور پانی کے برابر ٹکڑوں میں لکڑی کا وزن کم ہے۔ اس لیے لکڑی پانی پر تیرتی ہے۔ یہ ایک عقلی اندازہ تھا اس کے درست یا غلط ہونے کی تصدیق کیسے کی گئی۔ انسان نے لوہے کے ٹکڑے کو لے کر اتنا ہلکا بنایا کہ وہ برابر کے پانی کے ٹکڑے سے ہلکا ہو گیا۔ ایسا پیدا کیا ہوا لوہا جب پانی پر رکھا گیا تو تیرنے کے قابل بنانے کے عمل سے وہ عقلی اندازہ درست ثابت ہو گیا جو لکڑی کے متعلق لگایا گیا تھا۔ عقلی اندازے کی تجربی تصدیق نے سائنس کو جنم دیا۔

آپ کو یاد ہو گا کہ ہم نے مثالیت کو نظریہ کہا ہے اور مادیت کو فلسفہ۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ مثالیت کی تجربی تصدیق ممکن نہیں۔ اس لیے مثالیت متضاد مفروضات کا مجموعہ رہی ہے۔ مادیت نے تجربی تصدیق کا طریقہ اپنا کر سائنس کو جنم دیا ہے۔

آگے چل کر ہم دیکھیں گے کہ ایک ہے علم اور دوسرا ہے علم کے حصول کا ذریعہ۔ مثالیت نے حصول علم کا ذریعہ محض عقل کو قرار دیا تھا۔ افلاطون کے الفاظ میں ''ذہن بذات خود مشاہدے اور حسی تجربے کی تصدیق کے بغیر صداقت کے انکشاف پر قادر ہے۔''

فلسفے کی ابتدا مثالیت کو مسترد کرنے سے ہوئی اور فلسفہ نے تجربیت کو حقیقت تک پہنچنے کا واحد ذریعہ قرار دیا۔ جان لاک نے کہا کہ انسان کا دماغ ابتداء میں سفید کاغذ کی طرح ہوتا ہے۔ جس پر ماحول کے تجربے و مشاہدات سے تاثرات ثبت ہوتے ہیں۔ ذہن ان تاثرات کو منظّم کرتا ہے انہی تاثرات پر ہمارا علم مبنی ہوتا ہے۔ وہ یہ سوال کرتا ہے کہ انسان اشیاء کے علم کو کیسے حاصل کرتا ہے۔ اور خود ہی جواب میں کہتا ہے کہ علم صرف اور صرف پانچ حواس سے حاصل ہوتا ہے۔ حواس خمسہ سے ماوراء کسی حقیقت کا کوئی وجود نہیں۔ جو چیز حواس خمسہ کی دسترس سے باہر ہے وہ قیاس ہے۔ مفروضہ ہے۔

انسانی شعور کی ابتداء کے بارے میں آپ نے جس بحث میں حصہ لیا کیا اس کی تجربی تصدیق بھی ممکن ہے؟ جواب ہے کہ ہم نے جو بحث کی ہے وہ تجربی تصدیق ہی سے اخذ کی گئی ہے یعنی یہ نتیجہ ہی ٹھوس اور زندہ سائنسی حقائق سے نکالا ہے کہ انسان نے پیداواری عمل

کے دوران ہاتھوں کی محنت سے جو کچھ تخلیق کیا شعور کے خلیات کی پیدائش کا باعث بنا۔انسان کی ابتدائی زندگی کی ہر شہادت زمین کی تہہ میں چھپی ہوتی ہے۔

ہمارے قدموں کے نیچے کی زمین ایک کتاب ہے۔ زمین کی اوپری سطح کا ایک ایک پرت تہہ در تہہ کسی کتاب کے صفحوں کی طرح ہے۔ ہم ان صفحوں کے اوپر اور آخری صفحے پر رہتے ہیں۔سب سے پہلے صفحے سمندر کی تہہ میں ہیں۔ ہمارے لیے ابھی اوپر کے صفحے کے قریب کے صفحات کو پڑھنا آسان ہے۔ کائنات کے راز ایک ہی دن میں انسان پر نہیں کھل جاتے۔ جوں جوں انسان کے علم کی سطح بلند تر ہوتی جاتی ہے۔ان رازوں سے پردے اُٹھتے چلے جاتے ہیں۔

انسان کی ابتدائی زندگی،شعور، زبان و بیان کے آغاز کے بارے میں زمین کی تہوں میں جو انسانی رکاز (fossils) دریافت ہوتے ہیں۔ان سے تحقیقی ماہرین بشریات نے انسانی شعور کی ابتداء اور ارتقاء کی تصدیق کی ہے۔

1960ء سے 1984ء تک کی دہائیوں میں برطانوی تحقیقی ماہر بشریات رچرڈ لیکی نے جو انسانی کھوپڑیاں اور جسم کی دوسری ہڈیوں کے رکاز دریافت کیے ہیں وہ 1.8 ملین سال پرانے ہیں۔ ان کو جوڑنے سے جو انسانی ڈھانچہ وجود میں آیا اس کا نام ہوموہیبلس (Homohabilis) رکھا گیا، اس کا مطلب ہے ہاتھ والا آدمی۔اس نام کے رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ ہوموہیبلس کے رکازوں کے ساتھ ہی پتھر کے قدم اوزاروں کا ایک بڑا ڈھیر بھی ہاتھ لگا ہے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہوموہیبلس انسان حقیقت میں اوزار بنانے کا کافی ماہر تھا۔

کھوپڑی کی بناوٹ اور اس کے اندرونی سطح کے نشانات سے ماہرین دماغ نے ہوموہیبلس کے دماغ میں ایک خاص علاقہ دریافت کیا ہے۔ یہ علاقہ انسانی دماغ کا وہ حصہ ہے جو بول چال کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالانکہ ہوموہیبلس کا دماغ انسانی دماغ کا آدھا تھا مگر اس کے باوجود بھی یہ اتنی اہلیت رکھتا تھا کہ چند ایک سادہ الفاظ بدبدا سکے۔ رکازی ثبوتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ہوموہیبلس 1.5 ملین سال پہلے ختم ہوگیا۔اس خاتمے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ صفحہ ہستی سے مٹ گیا تھا۔ بلکہ اب وہ بدل کر ایک نئی شکل میں ڈھل چکا تھا جسے ہومو ایریکٹس کہتے ہیں (Homoerectus) کے باقیات پورے

Sanjh Lok Raj

ڈھانچے کی شکل میں دریافت ہوئے ہیں۔ انسان کی یہ پہلی نوع ہے جس نے افریقہ کے پنگھوڑے کو چھوڑ کر ساری دنیا میں پھیلنا شروع کیا۔ چہرے کی بناوٹ کے لحاظ سے ہوموایریکٹس اپنے پیش رو ہوموہیبلس سے بہت زیادہ مختلف نہ تھا مگر پھر بھی جو چیز اس کو ہیبلیس سے الگ کرتی ہے وہ اس کے دماغ کا سائز ہے۔ اس کا دماغی حجم 1000 ملی لیٹر تھا جبکہ ہوموہیبلیس کا 680 ملی لیٹر اور آج کے انسان کا دماغی حجم 1350 ملی لیٹر ہے۔

ہوموایریکٹس کا بڑا دماغ اور اس کی اعلیٰ تر عقل کا اندازہ اس کے پتھروں کے ترقی یافتہ اوزاروں سے لگایا جا سکتا ہے۔ ہوموایریکٹس آگ کا استعمال بھی سیکھ گئے تھے۔

ہوموہیلبس کے 680 ملی میٹر دماغ سے بڑھ کر ہوموایریکٹس کے 1000 ملی لیٹر حجم کے دماغ تک کا درمیانی عرصہ ان دماغی خلیات کی پیدائش سے دماغ کے سائز کے بڑھنے کا عرصہ ہے۔ جس میں انسان نے اوزار پیدا کیے۔ انھیں ترقی دی اور پیداوار کے لیے کی گئی محنت کے دوران دماغی خلیات نے جنم لیا۔ یہ تخلیقی خلیات ترقی کرتے کرتے آج کے انسان کو انٹرنیٹ تک لے آئے ہیں۔ آج کا انسان کلوننگ تک کامیاب ہے۔ اس ساری بحث سے نتیجہ یہ نکلا کہ انسانی شعور انسان کو تحفے میں نہیں ملا بلکہ اس نے اپنی محنت سے تخلیق کیا ہے۔

Sanjh Lok Raj

زبان

آپ نے کبھی دریائے سندھ دیکھا ہے؟ یہ پاکستان کا سب سے بڑا دریا اور دنیا کے بہت بڑے دریاؤں میں سے ایک ہے؟ لیکن اگر آپ اتنے گہرے اور چوڑے دریا کے بہاؤ کے مخالف جاتے ہوئے اس کا منبع معلوم کریں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ نہ صرف دریائے سندھ بلکہ دنیا کا ہر بڑا دریا ایک چھوٹے سے چشمے، ایک چھوٹی سی ندی سے شروع ہوتا ہے پھر ہر بار کسی معاون کے شامل ہونے سے زیادہ گہرا اور زیادہ چوڑا ہو جاتا ہے۔ انسانی شعور کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔ پچھلے باب میں ہم ایک کھوجی کی طرح انسانی شعور کے دریا کے منبع پر پہنچ پائے تھے۔ جہاں ہم نے دیکھا کہ پیداواری عمل کے دوران انسانی ہاتھوں سے کی گئی محنت انسانی دماغ میں چند تخلیقی خلیات کی پیدائش کا باعث بنی تھی۔ اس سے عقل وشعور کی ابتدا ہو گئی تھی۔ پھر انسانی شعور کے ابتدائی چشمہ میں ایک اور معاون شامل ہو گیا۔ یہ معاون تھا اظہار اور زبان و بیان، بول چال۔

آج کل تو خیر ڈیجیٹل گھڑیوں کا دور ہے مگر سوئیوں والی گھڑیاں بھی گھروں میں موجود ہیں اگر آپ سوئیوں والی گھڑی کی گھنٹے والی سوئی پر تھوڑی دیر کے لیے نظر ٹکائے رکھیں تو اپ کو ایسا لگے گا کہ جیسے وہ رکی ہوئی ہے۔ مگر جب آپ تین چار گھنٹے کے بعد اس پر نظر ڈالتے ہیں تو آپ دیکھتے ہیں کہ گھنٹے والی سوئی بھی کافی فاصلہ طے کر گئی ہوئی ہے۔ اس طرح ہماری زندگی میں ہونے والی تبدیلیاں بھی فوری طور پر ہمیں نظر نہیں آ رہی ہوتیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید تاریخ کی گھنٹے والی سوئی بھی غیر متحرک ہے۔ لیکن کچھ سالوں کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ تاریخ آگے کی طرف بہت سے قدم بڑھا گئی ہوئی ہے جس سے ہم خود بھی بدل گئے ہیں اور ہمارے اردگرد بھی بہت سی تبدیلیاں رونما ہو گئی ہیں۔

Sanjh Lok Raj

جو انسان کسی تبدیلی کو لانے کا باعث بنتے ہیں۔ ان کے زمانے کے لوگوں کے لیے یہ تبدیلی بہت بڑی انسانی کامیابی اور ترقی کا اگلا قدم مانی جاتی ہے۔لیکن اگلی نسلیں جو اس تبدیلی کو اپنی پیدائش کے ساتھ وراثت میں لے لیتی ہیں ان کے لیے یہ تبدیلی معمول کا ایک واقعہ بن چکی ہوتی ہے۔اور اتنی اہم نہیں رہ گئی ہوتی۔

میری نسل کے لوگوں نے ٹیلی ویژن اپنی جوانی کے دنوں میں پہلی بار دیکھا تھا۔اس زمانے کے لوگ بڑی خوشگوار حیرت کے ساتھ ٹیلی ویژن کے سامنے بیٹھتے تھے۔ ٹیلی ویژن کی ایجاد کے بارے میں گفتگو کرتے اور اسے انسانی عقل کا بہت بڑا کرشمہ قرار دیتے تھے۔ یہ بات ان کے لیے حیرت کا باعث تھی کہ انٹینا کس طرح ہوا سے لہریں پکڑتا ہے اور یہ مشین ان لہروں کو تصویر میں تبدیلی کر دیتی ہے۔اس کے بعد کی نسلیں جن کی پیدائش سے پہلے ٹیلی ویژن پہلے سے ان کے گھر پر موجود تھا۔جن بچوں نے آنکھ ہی ٹی وی کے سامنے کھولی تھی۔تب تک ٹی وی پرکشش رنگوں، سینکڑوں چینل اور ترقی یافتہ فوٹو گرافی تک پہنچ گیا ہوا تھا۔ ہمارے زمانے کا بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی جو ہمارے لیے کرشمہ تھا نئی نسل کے نزدیک ہماری پسماندگی کی علامت بن گیا۔ کتنی جدوجہد، کتنی ناکامیوں، کتنے سائنسدانوں کی سالوں کی محنت کے بعد جو بلیک اینڈ وائٹ ٹیلی ویژن وجود میں آیا تھا۔ یہ نئی نسل اس سے ناواقف تھی اور اس کے بارے میں سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی کیونکہ ان کے نزدیک تو ٹی وی جیسے انسان کے اس دنیا میں آنے کے ساتھ ہی آ گیا ہو؟

زبان کے متعلق بھی ہمارا خیال کچھ ایسا ہی ہے۔ جیسے مختلف علاقوں کے لوگ اپنی اپنی علاقائی زبانوں کے لاکھوں الفاظ کا ذخیرہ لے کر پیدا ہوئے ہیں اور آنے والی نسلوں نے ان سے یہ زبانیں سیکھ لی ہیں۔ ہم لوگوں نے بچپن میں جانوروں کے آپس میں باتیں کرنے۔کسی بچے کے پیدا ہوتے ہی سوالوں کا جواب دینے۔ پرندوں کا کوہ قاف کی طرف جانے والے شہزادے کو آگے جا کر پیش آنے والی مشکلات سے آگاہ کرنے کی کہانیاں سنی ہوتی ہیں اس لیے ہم سمجھ لیتے ہیں کہ بولنے کے لیے منہ میں بس زبان کا ہونا ہی کافی ہے۔لیکن ہم اپنے اردگرد یہ بھی دیکھتے ہیں کہ زبان تو چوپایوں کے منہ میں بھی ہے۔مگر وہ بامعنی گفتگو تو نہیں کر پاتے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سی شے ہے جو جدید انسان کو قوت گویائی کا مالک بناتی ہے۔

Sanjh Lok Raj

اور جس سے اس کے آباء واجداد محروم تھے؟

عتیقی ماہرین بشریات کا خیال ہے کہ اکیلا انسان تن تنہا جنگلی جانور ہی رہتا۔ ایک گروہ میں رہ کر اور مل جل کر کام کرنے سے وہ انسان بن گیا۔ آدمیوں کا پورا غول کسی عظیم الجثہ جانور کی گھات لگا کر شکار کرتا تو جانور کے پہلوؤں پر ایک نہیں درجنوں بھالے پڑے۔ انسانی غول اس جانور کا اس طرح پیچھا کرتا تھا جیسے یہ غول خود کوئی بہت سے پیروں اور بازوؤں والا جانور ہو۔ صرف درجنوں ہاتھ ہی نہیں بلکہ درجنوں دماغ بھی مل کر کام کرتے تھے۔

جب بہت سے آدمی مل کر ایک ہی کام کرتے ہوں تو ان کے درمیان ربط و تعاون کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ربط کسی سگنل یا اشارے یا گفتگو ہی سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ شکار کی زندگی میں سگنل کی بہت اہمیت تھی۔ یہ سگنل خاص آواز ہوا کرتی تھی۔ پھر یہ سگنل اشاروں میں بدل گئے۔

ابتدائی انسان جو کچھ کہنا چاہتے تھا وہ اپنی بات سمجھانے کے لیے اپنا ہاتھ اور کبھی کبھار پورا جسم استعمال کرتا تھا۔ لیکن سب سے زیادہ اس کے ہاتھ اظہار کرتے تھے مثلاً وہ کسی خار پشت کے بارے میں بتانا چاہتا تھا تو صرف اس کی تصویر کشی ہی نہیں کرتا تھا بلکہ ایک لمحے کے لیے خود خار پشت بن کر دکھاتا اور دوسروں کو دکھاتا کہ خار پشت کیسے زمین کھودتی ہے اور مٹی کو اپنے پنجوں سے ہٹاتی ہے۔ کسی کہانی کا اظہار خاموش حرکات و سکنات کے ذریعے کرنے کے لیے زمانہ تاریک سے قبل کے آدمی کو بہت باہوش اور چوکنا رہنا پڑتا تھا آج کے زمانے کے ایک سچے فنکار کی طرح۔

جب کوئی شخص اشاروں سے کوئی واقعہ بیان کر رہا ہوتا تھا تو مخاطب اس کی حرکات و سکنات دیکھ کر اپنے ذہن میں تصور بنا رہا ہوتا تھا۔ اس طرح واقع بیان کرنے والے اور مخاطب کے دماغ میں سوچنے اور خیالات پیدا ہونے کا عمل جاری رہتا۔ خیالات کا پیدا ہونا اس بات کا تقاضا کرتا تھا کہ اس کا اظہار بھی ہو۔ لیکن ابھی تک ہمارے آباء واجداد کے پاس صوتی عضو اس طرح کے نہیں تھے جس طرح کے آج کے انسان کے پاس ہیں۔ پہلے پہل انسان کی زبان اور گلا نافرمان بردار تھے۔ ایک آواز اور دوسری آواز میں بہت کم فرق ہوتا۔ شعور کے خلیے تخلیق ہونے کے بعد آنے والی نسلوں کو منتقل ہونے شروع ہو گئے تھے مگر خیالات کا اظہار اشاروں ہی سے ہوتا رہا۔

Sanjh Lok Raj

آج بھی ہم نے اپنے آباء واجداد کی ہزاروں سال پرانی اشاروں کی زبان محفوظ کر رکھی ہے سر کو اوپر نیچے ہلانے سے ''ہاں'' اور دائیں بائیں ہلانے سے ''نہ'' کا پتہ چل جاتا ہے۔سلام کرنا چاہتے ہیں تو ہاتھ کو پیشانی تک لے جاتے ہیں۔ پیشانی پر بل ڈال کر آنکھیں گھور کر بچے کو کسی کام سے منع کرتے ہیں۔ پانچوں کھڑی انگلیوں کو بند کر کے پھر آہستہ آہستی کھول کر سورج کے نکلنے کا اشارہ کرتے تھے تو ابتدائی لوگ سورج کے بارے میں سوچتے تھے خواہ اس وقت آدھی رات ہوتی۔ اس وقت کے لوگوں نے کوئی ایسی چیز نہیں چھوڑی ہوگی جس کا اشارہ نہ بنایا ہو۔لیکن جب اشارات اور جذبات میں اضافہ ہوتا گیا دماغ کے خلیے برابر بڑھتے گئے اور ان خلیوں کے درمیان سلسلے زیادہ پیچیدہ ہوتے گئے اور دماغ کا سائز بھی بڑھتا گیا۔

اشاروں کی زبان پر معنی تھی مگر محدود تھی۔ زوردار اشارے بھی رات کے اندھیرے میں دیکھے نہیں جا سکتے تھے۔ آواز کا استعمال ہونے لگا۔ خاص آوازوں کے ساتھ خاص معانی جڑنے کا عمل شروع ہو گیا۔ ان کے اردگرد ایک مادی دنیا جس میں جانور، درخت، دریا، پہاڑ، پرندے اور ان کے اوزار ان کی آنکھوں کے سامنے پہلے سے موجود تھے۔ اردگرد کی چیزوں اور جانوروں سے ان کا بار بار واسطہ پڑتا تھا۔کسی جانور کے سامنے آنے پر کسی دوسرے شخص کی آواز آتی گھوڑا۔ تو گھوڑے کا ذہن کے پردے پر بننے والا عکس اور آواز ''گھوڑا'' کے درمیان عصبی ربط قائم ہو جاتا۔ پھر بار بار کے استعمال سے آواز ''گھوڑا'' اور عکس جو اس کے ذہن پر بنتا تھا اتنا پختہ ہو گیا کہ پھر جب کبھی گھوڑا سامنے نہیں بھی ہوتا تو بھی گھوڑا آواز کان میں پڑنے سے ذہن خود ہی اس آواز کے ساتھ عصبی ربط کے طور پر جڑا ہوا عکس اُبھار لیتا۔کسی چیز کے سامنے ہونے پر کسی کی آواز کان میں پڑتی آگ۔ تو آواز آگ اور ذہن کے پردے پر پڑنے والا آگ کا عکس آپس میں ایسے جُڑ جاتے کہ آواز کے ہونے سے عکس اُبھرتا اور عکس کے ذہن میں اُبھرنے سے آواز اُبھرتی۔ اس طرح ابتدا میں انسان نے تمام مادی چیزوں کے ساتھ آوازوں کو جوڑ لیا جنھیں نام (Noun) کہا جاتا ہے۔ اس طرح یہ عمل انسانی دماغ میں یادداشت کے خلیات پیدا کرنے اور وقت کے ساتھ ان کی نشو ونما کا باعث بنا۔

مگر جدید سائنسی تحقیق تو کچھ اور بھی بتاتی ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جبڑے،

Sanjh Lok Raj

دانت، ہڈیاں اور کھوپڑیاں تو لاکھوں سال میں پتھر کی بن جاتی ہیں جن سے ان کا وجود برقرار رہتا ہے ان پتھرائی ہوئی ہڈیوں کو رکاذ (Fossil) کہتے ہیں۔ مگر صوتی عضو جو واضع طور پر بولنے کی کنجی ہوتا ہے اور دماغ جس کی پیچیدگی اپنے مالک کی عقل کا پتہ دیتی ہے۔ ایسے نرم عضلات سے بنے ہوتے ہیں کہ وہ پتھرائے نہیں جا سکتے۔ مگر اس مسئلہ سے نمٹنے کے لیے بالواسطہ راہیں موجود تھیں۔

نیورولاجسٹوں نے دماغ میں دو ایسے مراکز کی نشاندہی کی ہے جن کا تعلق بولنے اور بات کو سمجھنے سے ہے۔ انیسویں صدی کے دو نیورولاجسٹوں (Neurologists) پال بروکا اور کارل ورنیکی نے ان مراکز کا پتہ لگایا تھا اس لیے ان دونوں کے اعزاز میں انہیں ''ورنیکی کا علاقہ'' اور ''بروکا کا علاقہ'' کہا جاتا ہے۔ بروکا کا علاقہ جیسے دماغ میں بائیں طرف کوئی ٹکڑا سا اُبھر آیا ہو۔ اس طرح بروکا کے علاقے کی موجودگی سے پتہ لگایا جا سکتا ہے کہ قدیم انسان میں بولنے کی صلاحیت موجود تھی یا نہیں۔

قدیم دماغوں میں بروکا کے علاقے کی موجودگی یا غیر موجودگی کا پتہ نہایت ڈرامائی طور پر لگا۔ اس کا پتہ ان سائنسدانوں نے لگایا جنھوں نے رکاذی کھوپڑی کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ انھوں نے بتایا کہ دماغ میں جو کچھ بھی موجود ہوتا ہے وہ کھوپڑی کی اندرونی سطح پر اپنی کہانی کے نشانات چھوڑ جاتا ہے۔ یہ بھی پتہ لگایا کہ ایک کیمیائی مادے لیٹیکس کے پتلے لیپ کو استعمال کر کے ان تمام نشانات کی ہو بہو نقل یا سانچہ تیار کیا جا سکتا ہے۔

چنانچہ 2 ملین سال سے کچھ کم پرانی ایک رکاذی کھوپڑی کے ساتھ ایسا ہی کیا گیا۔ کھوپڑی کی بناوٹ اور اس کی اندرونی سطح پر موجود نشانات سے ماہرین نے ہیبلیس (ہاتھ والا آدمی) کے دماغ میں ایک خاصہ علاقہ دریافت کر لیا۔ یہ علاقہ انسانی دماغ کا بروکا کے علاقے سے ملتا جلتا ہے۔ یہ علاقہ بول چال یا گویائی کے لیے بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ حالانکہ ہیبلیس کا دماغ آج کے انسان کے دماغ کا آدھا تھا مگر اس کے باوجود بھی یہ اتنی صلاحیت رکھتا تھا کہ چند ایک سادہ الفاظ بدبدا سکتا تھا اس سے زیادہ نہیں۔

اب تک انسانی تہذیب زراعت کے دور میں داخل ہونا شروع ہو گئی تھی۔ لوگوں نے خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے دریاؤں کے کنارے بستیاں بسانا شروع کر دی تھیں کھال کے

Sanjh Lok Raj

کپڑے بنائے جانے کے بعد اب ٹوکریاں اور بنے جانے والے کپڑے تیار ہونے لگے تھے۔ زراعت کی تہذیب کا آغاز میسو پوٹیمیا (عراق) کی سرزمین سے ہوا۔ وادئ سندھ میں زرعی تہذیب کا آغاز 25000 قبل مسیح ہو چکا تھا۔ زراعت پھیلنے کے سبب دیگر مشغلے بھی فروغ پانے لگے۔ جیسا کہ مکان بنانا، برتن بنانا۔ اب تک پتھر کے اوزاروں کی جگہ کانسی کا استعمال بھی ہونے لگا تھا۔ زرعی معیشت کی ایک قدرتی شاخ تھی مویشی پالنا۔ ان سے دودھ اور گوشت حاصل کرنے کے علاوہ ہل چلانے اور وزن ڈھونے کے لیے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔

انسان نے ابتدائی آوازیں قدرتی آوازوں کی نقل میں بنائیں یہ آوازیں وقت کے ساتھ ساتھ زبان کے الفاظ بنتے گئے۔ مٹی کے پہیے بنا کر انھیں آگ میں پکا لیا جاتا تھا۔ ان پہیوں سے بیل گاڑی بنائی جاتی۔ ایسی بیل گاڑی جب چلتی تھی تو اس میں سے آوازیں آتی تھی۔ گرڑ...... گرڑ۔ جس سے آواز بنائی گئی گاڑی۔ بھینس کا لفظ (ابھی تک ہم اسے لفظ نہیں کہہ سکتے) بھینس آواز اس کے بولنے کی آواز کی نقل تھی۔ زلزلہ آتا تو زمین میں گونج سنائی دیتی جو آج کل شور میں دب جاتی ہے۔ اس گونج کی آواز بھوں ں جیسی ہوتی ہے۔ مقامی زبانوں میں زلزلے کو بھوکمپ یا بھونچال کہتے ہیں۔ لیکن اب تک تو یہ آوازیں بہت ترقی کر چکی تھیں۔ اسم (Noun) کے ساتھ اب حرکتوں کے نام (Verbs) بھی بن چکے تھے۔

اگر ہم الفاظ کی تخلیق کو مرحلوں میں تقسیم کر کے دیکھیں تو مادی اشیاء انسان کے ارد گرد موجود تھیں۔ جو انسان کے مشاہدے میں آتی رہتی تھیں۔ جن کا عکس انسان کے دماغ کے پردے پر پڑتا تھا۔ انسان نے کچھ آوازیں بنائیں۔ انسانی دماغ نے مادی چیزوں کے عکس اور آوازوں کے درمیان عصبی ربط قائم کر لیا۔ اب اگر مادی چیز سامنے نہ بھی ہو تب بھی آواز پر ہمارا دماغ ان مادی چیزوں کے عکس کو اُبھار لیتا ہے۔ جیسے بیل پہلے سے موجود تھا۔ اس کا عکس انسانی دماغ پر بنتا تھا پھر آواز بیل اس کے ساتھ منسلک ہوگئی۔ اب اگر بیل کی تصویر ہو یا بیل خود موجود ہو تو ہم کہتے ہیں کہ یہ بیل ہے اور اگر بیل آواز آئے تو ہمارا ذہن بیل کا عکس اُبھار لیتا ہے۔ یہی آوازیں بعد میں زبانوں کے الفاظ بن گئیں۔

مادی چیز عکس عکس+آواز آواز لفظ

صدیوں کے دوران الفاظ کئی بار اپنا روپ بدلتے ہیں۔ وہ سفر کر کے ایک زبان سے دوسری زبان میں پہنچتے ہیں۔ ان کے شروع اور آخر کے حصے بدلتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھار صرف پرانے الفاظ کی مادی جڑیں ہی کسی پرانے جلے ہوئے درخت کی جڑوں کی طرح باقی رہ جاتی ہیں۔ اور صرف جڑ ہی کے ذریعے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ لفظ اصل میں کہاں سے آیا ہے۔ اس طرح بعض اوقات زبانوں کی تہہ کھودتے ہوئے ہمیں صرف الفاظ نہیں بلکہ قدیم زمانے کے لوگوں کے خیالات بھی ملتے ہیں۔

یہاں ٹھہر کر ہم الفاظ کی مادی جڑوں کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کیونکہ یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ ہم مادے اور شعور کے تعلق کو بھی سمجھ سکیں۔

1۔ غنیمت ہے کہ آج کے گئے گزرے دور میں چند لوگ مل بیٹھ کر لوگوں کے مسائل کا حل سوچتے ہیں۔ یہاں غنیمت کا جو لفظ استعمال ہوا ہے اس کی مادی جڑ ہے غنم۔ غنم بھیڑ بکریوں کو کہتے ہیں۔ عربوں کے معاشرے میں اس وقت مویشی ہی سب سے بڑی دولت تھی۔ جنگ میں بھی زیادہ تر مویشی ہی ہاتھ آتے تھے اس اعتبار سے ایسے مال کو جو جنگ میں ہاتھ آئے مال غنیمت کہا جانے لگا۔ پھر جب جنگیں عرب کے خطے سے باہر نکلیں اور فتوحات ہوئیں تو دیگر سامان جیسے کپڑا، برتن، زیورات اور چار پائیاں وغیرہ ہاتھ آئیں تو بھی مال غنیمت ہی کہلاتیں حالانکہ بھیڑ بکریاں اب اس میں نہیں تھیں۔ پھر ہر وہ چیز جو بغیر معاوضہ اور محنت کے ملنے لگی غنیمت کہلاتی تھی۔

2۔ نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ بچے والدین کا حکم ماننا تو کجا بات سننے کو تیار نہیں۔ نوبت ایک خاص قسم کا ڈھول یا نقارہ ہے جو فوج کی صفیں درست کرنے انھیں مختلف ہدایات دینے کے لیے بجایا جاتا تھا۔ حملہ آور افواج نوبت بجاتی ہوئی آتی تھیں جس کی آواز سے عام لوگ اندازہ لگاتے تھے کہ حملہ آور فوج آگے بڑھ رہی ہے یا پیچھے ہٹ رہی ہے۔ نوبت شہر کی فصیل تک آ گئی ہے۔ نوبت قلعے کے دروازے تک پہنچ گئی ہے۔ نوبت قلعے کے اندر داخل ہو گئی ہے۔ اب مادی چیز جیسی نوبت تو رہی نہیں۔ اب حالات کی تبدیلی کے لیے ہم کہتے ہیں کہ پاکستان میں معاشی بدحالی کی نوبت یہاں تک آ گئی ہے کہ 55 فیصد لوگ غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

3۔ ڈراپ کا لفظ اگرچہ انگریزی زبان کا ہے مگر ہم کثرت سے استعمال کرتے ہیں یہاں تک کہ اب اردو لغت کا حصہ بن گیا ہے۔ ڈراپ یعنی قطرہ بذات خود ایک مادی چیز ہے۔ قطرے کے نیچے گرنے کے عمل کا مشاہدہ کرتے ہوئے انسان نے اس سے کئی معنی اخذ کیے۔ کھلاڑی سے کیچ ڈراپ ہو گیا۔ مجھے راستے میں ڈراپ کر دینا۔ تحقیقاتی کمیشن نے انکوائری ڈراپ کر دی۔ یہ ڈرامے کا ڈراپ سین ہے۔

4۔ قائد کا لفظ ہم آج بھی بہت سی سیاسی شخصیات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ قائد بھی عربی کا لفظ ہے۔ قائد اس شخص کو کہتے ہیں جو اونٹ کی نکیل پکڑ کر آگے آگے چل رہا ہو۔ وہ شخص جس کے پاس یہ طاقت ہوتی ہے کہ اپنی منشا کے مطابق اونٹ کو مقررہ راستے پر چلنے پر مجبور کرے۔

5۔ کچھ الفاظ کی مادی جڑیں زمین میں ہوتی ہیں مگر ان کے مطلب و معانی کی شاخیں آسمان تک پہنچ جاتی ہیں۔ خطۂ عرب چونکہ تپتا ہوا صحرا تھا اس لیے کھجور کے علاوہ کوئی خاص سایہ دار درخت نہیں اُگتا تھا۔ جہاں کہیں کھجوروں کے درخت قریب قریب اور گھنے ہوتے تھے اور ان پر انگوروں کی بیلیں چڑھی ہوتی تھیں تو اسے جنت کہتے تھے۔ اس طرح عربی لغات کے مطابق جہنم کا لفظ عبرانی زبان سے عربی میں آیا ہے۔ یہ لفظ دو لفظوں سے مل کر بنا ہے۔ جی اور ہنوم۔ جی کا مطلب ہے وادی اور ہنوم اس شخص کا نام تھا جس کے نام پر یہ وادی تھی۔ یہ وادی یروشلم کے جنوب میں واقع تھی۔ اس جگہ کی خصوصیت یہ تھی کہ وہاں دیوتا کے سامنے انسانوں کی قربانی کی جاتی تھی اور ان قربان شدہ لاشوں کو جلا دیا جاتا ہے۔ اس سے لفظ جہنم کا مفہوم بن گیا وہ جگہ جہاں انسانوں کو جلایا جاتا ہے۔ اس طرح ہم بہت سی مادی چیزوں کی خصوصیات سے مجرد اور غیر مادی مفہوم بناتے ہیں۔ جیسے دریا دل، پتھر دل، شیر دل، بزدل وغیرہ۔ اس طرح انسان نے مادی چیزوں کی خصوصیات سے مجرد یا غیر مادی مفہوم سمجھنے میں مدد لی۔

6۔ انصاف کے لفظ کے معنی کتنے وسیع ہیں مگر یہ لفظ نصف کی جمع ہے جیسے شخص کی جمع اشخاص اور نصف کی جمع انصاف۔

انگریزی زبان ہی کو لیجیے ہر سال کروڑوں کتابیں ہزاروں موضوعات پر انگریزی

Sanjh Lok Raj

زبان میں چھپتی ہیں۔ مگر لفظ زبان کا ماخذ اور مادی جڑ ہمارے منہ میں موجود عضو ''زبان'' ہے۔ اس طرح انسان مرحلہ وار آگے بڑھنے کے عمل سے گزرتا ہوا زبان و بیان کا مالک بن گیا زبان بھی شعور کی طرح انسان کو تحفہ میں نہیں ملی۔ ہزاروں لاکھوں سالوں میں انسان یہ صلاحیت پیدا کرنے کے قابل ہوا ہے۔

دماغ میں شعور کے خلیات کا پیدا ہونا۔ خیالات کا جنم لینا۔ خیالات کا اظہار اشاروں سے کرنا۔ یادداشت کے خلیے پیدا ہونا۔ خیالات کو آوازوں میں بدلنا۔ آوازوں میں فرق کرنے کے لیے آوازوں کے مختلف اتار چڑھاؤ بنانا۔

اگر آج کے انسان کے بولنے کی صلاحیت کا قدیم انسان کو بولنے کی صلاحیت سے موازنہ کریں تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ آوازیں صوتی حبل (Elastic Vocal Card) کے ارتعاش سے صوتی بکس یا حنجرہ (Larynx) میں پیدا ہوتی ہیں۔ پھیپھڑوں سے خارج ہونے والی ہوا صوتی حبل کو مرتعش کرتی ہے۔ دانت، تالو، زبان اور چہرے کے عضلات اس آواز کو گفتگو میں بدلتے ہیں۔

ہمیں یہ بات بھی ملحوظ رکھنی چاہیے کہ آواز پیدا کرنے کے عضو اور ترقی یافتہ دماغ بھی کسی شخص کو بولنے کی گارنٹی فراہم نہیں کرا سکتے۔ بولنا تو آج ہمیں سیکھنا پڑتا ہے۔ اس میں عمدہ قوت سماعت، یادداشت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ایک بچہ اپنا پہلا لفظ ایک سال کا ہونے تک ادا کرنے کے قابل ہوتا ہے۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہونے لگتا ہے دوسرے الفاظ اور ان کے معنی بھی سیکھنے لگتا ہے۔ البتہ جب تک دوسروں کو وہ یہ الفاظ بولتے ہوئے نہ سنے تو اس وقت تک وہ بھی انہیں نہیں بول سکتا۔ اگر کوئی بچہ بہرہ ہو اس کا صوتی عضو بھی بالکل ٹھیک ہو۔ دماغ بھی ٹھیک ہو تب بھی وہ بولنا نہیں سیکھ پاتا۔ آج بھی بچہ اپنے ابتدائی الفاظ عصبی ربط سے سیکھتا ہے جسے (Neuro-association) کہتے ہیں۔ اب شعور اور زبان دونوں کا نشو ونما پانا ایک دوسرے پر منحصر ہو گیا۔

Sanjh Lok Raj

لکھائی

ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ وقت کے قدموں کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ ابتداء ہی سے انسانی ضرورتیں بھی بڑھ رہی تھیں۔ انسان نے اپنی ان بڑھتی ہوئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے آج تک بہت کچھ تخلیق کیا ہے اور تخلیق کے اس عمل میں ہر بار اس نے اپنے اردگرد کی مادی دنیا سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ پیداواری عمل کے دوران اپنے ہاتھوں سے کی گئی محنت کے عمل میں ذہن میں خلیے بنے۔ مادی چیزوں کے عکس کے ساتھ آوازوں کو جوڑ کر بول چال کا آغاز کیا اور اب انسانی شعور کو ایک اور بہت بڑا معاون مل گیا وہ ہے لکھائی۔

زبان تو لکھنا شروع کرنے سے بہت پہلے سے آوازوں کی شکل میں موجود تھی۔ خیالات نے بھی آوازوں کا لباس پہن لیا تھا۔

جب بہت زیادہ معلومات اور واقعات نہیں تھے تو آدمی ہر بات کو اپنی یادداشت میں رکھتا تھا۔ داستانیں اور قصے وغیرہ ایک آدمی کے ذریعے دوسروں تک پہنچتے تھے۔ ہر بڈھا آدمی ایک جیتی جاگتی کتاب ہوتا تھا۔لوگ کہانیاں، داستانیں، واقعات اور تمام سوجھ بوجھ کی تمام باتیں یاد کر لیتے تھے۔ اور اپنے بچوں کو ایک ورثے کی طرح ان کے سپرد کر دیتے۔ اس طرح یہ سلسلہ نسل در نسل چلتا رہا۔لیکن یہ ورثہ جتنا زیادہ ہوتا گیا اتنا ہی اسے یاد رکھنا بھی مشکل ہوتا گیا۔

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے انسان نے تصویری حروف تخلیق کر لیے۔ بیل کے لیے وہ بیل کی تصویر بناتے تھے اور درخت کے لیے پورے درخت کی معہ شاخوں کے تصویر کشی کرتے تھے۔ صدیاں گزرنے پر ان تصویروں کو آسان بنا کر نشانوں میں تبدیل کر دیا

Sanjh Lok Raj

گیا۔ ہمارے حروف تہجی ان تصویروں ہی سے نکلے ہیں۔تحریر کی تاریخ ان تصویری حروف سے شروع ہوتی ہے۔تصویری لفظوں میں اصل تصویر کی اہمیت رفتہ رفتہ بالکل ختم ہوگئی اور یہ تصویریں فقط آوازوں کی نمائندگی کرنے لگیں۔

تصویروں کی بناوٹ آسان ہوگئی آخر تجرید کا عمل اتنا بڑھ گیا کہ تصویریں دائروں اورخطوں میں بدل گئیں۔

حرف ''ب'' عبرانی لفظ بیت ''گھر'' سے بنا ہے۔ پہلے گھر کی پوری چار دیواری بنائی جاتی تھی۔ دروازے پر بیٹھا آدمی گھٹتے گھٹتے ایک نقطہ رہ گیا۔

حرف ''ج'' عربی لفظ جمل ''اونٹ'' سے بنا ہے۔ اونٹ کا لٹکا ہوا ہونٹ، کان اور گردن کو ملا کر ج لکھا جاتا تھا اور اوپر بیٹھا شخص اب ایک نقطہ بن گیا تھا۔

اب ہمارے حروف تہجی میں ان تصویروں کے بارے میں قیاس کرنا مشکل ہے جن سے وہ نکلے ہیں۔کون یہ سوچ سکتا ہے کہ 'A' کا حرف دراصل بیل کا سر ہے۔لیکن اگر آپ 'A' کو الٹا دیکھو تو وہ سینگ دار سر سے مشابہ نظر آئے گا۔ سامی زبان میں سینگ دار سر حرف 'A' تھا۔حرف 'O' آنکھ کے لیے تھا اور P لمبی گردن والے سر کے لیے۔

اب آوازیں حرفوں میں قید ہوگئیں۔ تجربے کو منتقل کرنے کے لیے بولنے والی زبان کو اب لکھا جانے لگا۔ہمیں پہلی تحریریں مزاروں کی لوحوں اور مندروں کی دیواروں پر ملی ہیں۔ یہ تصویروں کی زبان میں پوری پوری کہانیاں تھیں۔ لوگوں کے بارے میں لوگوں کے لیے کہانیاں۔ کسی سردار کی لوح مزار پر اس کی مہموں اور لڑائیوں کے کارنامے کندہ ہوتے تھے تا کہ وہ آنے والی نسل کو یاد رہیں۔ جب دوسرے قبیلے کے سرداروں کو پیغام بھیجے جاتے تھے تو درخت کی چھال کے ٹکڑے یا مٹی کی تختی پر نقش کردیئے جاتے۔

ہر پاکستانی بچے کو یہ جاننا چاہیے کہ وادیٔ سندھ کے لوگ 25 ہزار سال قبل زراعت کے دور میں داخل ہو چکے تھے۔ وادیٔ سندھ میں آج کا پورا پاکستان اور شمالی ہندوستان کے کچھ علاقے شامل ہیں۔انڈیا کا لفظ ہی سندھ (Indus) سے نکلا ہے۔ ہزاروں سالوں میں وادیٔ سندھ کے لوگوں نے دریاؤں اور چشموں کے کنارے بستیاں بسائیں۔ پکے مکان تعمیر کرنے کا طریقہ دنیا کو سکھایا۔مٹی کے برتن پکا کر انہیں غلہ محفوظ کرنے کے لیے استعمال

Sanjh Lok Raj

کیا۔ پہیہ گاڑیاں بنائیں۔ بیڑے کے ذریعے دریائے سندھ سے سمندر اور پھر عراق اور مصر سے تجارت کیا کرتے تھے۔ دھاتوں کو پگھلانے کا فن سیکھ چکے تھے۔

اب تک اس تہذیب کی 175 بستیاں اور دو بڑے شہر ہڑپہ (ساہیوال) اور موئین جو دڑو (لاڑکانہ) دریافت ہو چکے ہیں۔ آریاؤں کی آمد سے قبل جو لوگ یہاں آباد تھے انہیں دراوڑ کہتے تھے۔ یہ لوگ جو زبان بولتے تھے اسے دراوڑی کہتے ہیں۔ دراوڑی لکھی بھی جاتی تھی۔ جس کے حروف ہڑپہ اور موئین جو دڑو سے ملنے والی مہروں پر کندہ ہیں۔ یہ حروف اور گنتی ان کی تجارتی ضرورتوں کے تحت وجود میں آئے۔

لیکن آثار قدیمہ کے ماہرین اور زبان دان ان حروف کو پڑھ نہیں سکے۔ تحقیق کے مطابق فونیقیوں نے دنیا بھر کو لکھنے کا ہنر سکھایا وہ اس طرح کے فونیقی حروف سے یونانیوں اور پھر رومیوں نے اپنے حروف بنائے۔

ہر پاکستانی طالب علم کو یہ بھی جاننا چاہیے کہ فونیقی وادئ سندھ کے لوگ تھے جو یہاں سے زراعت، تجارت، دھات سازی، گنتی اور لکھنے کا علم اپنے ساتھ لے گئے تھے دنیا کی پہلی کتاب رگ وید میں انہیں پنی کہا گیا ہے۔ آکسفورڈ کلاسیکل ڈکشنری میں یہ (Poeni) اور

ki chothi
kitab\Compare_Arabic_Hebrew_etc2.jpg
not found.

یونانیوں نے انہیں (phoeni) کہا ہے جس سے Phoenician کا لفظ بنا ہے۔

Phoenician

Sanjh Lok Raj

Early Greek

Roman

جن لوگوں کی ضرورتیں دوسروں کی ایجادوں سے پوری ہو جائیں انہیں کچھ ایجاد کرنے کی ضرورت نہیں رہتی۔ اور نہ ہی انہیں یہ سوچنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ یہ ایجاد کن ضرورتوں کے تحت، کس مرحلے پر، کن کن عوامل کی مدد سے وجود میں آئی۔ یہاں مقصد تحریر کی تاریخ کو بیان کرنا نہیں ہے بلکہ سمجھنے والی بات یہ ہے کہ حروف بھی مادی چیزوں کی تصویروں کے عکس ہیں جو گھٹتے گھٹتے علامات بن کر رہ گئے۔ اس سے ہمیں مادے اور شعور کے تعلق کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

Sanjh Lok Raj

تعلیمی نظریے

انسانی تاریخ کے ابتدائی ہزاروں سال انتہائی سست رفتار جسمانی اور ذہنی ترقی کا دور تھا انسان کے دماغ میں پیدا ہونے والے خلیات (خواہ ان کا تعلق نئی نئی چیزیں تخلیق کرنے سے تھا خواہ یادداشت سے) اگلی نسلوں کو وراثت میں منتقل ہوتے چلے جا رہے تھے آنے والی نسلیں اپنے بزرگوں کی بنائی ہوئی آوازوں کے ذریعے چیزوں اور خیالات کی پہچان کرنے لگی تھیں۔ جیسے ہی ایک آواز کان میں پڑتی 'پہاڑ' تو سب سننے والوں کے دماغ میں ایک ہی تصویر ابھرتی۔ تب یہ آواز زبان کہلانے کے قابل ہوگئی تھی۔

خیالات کو مادی شکل میں محفوظ کرنے کے لیے انسان نے تحریر ایجاد کر لی تھی۔ تحریر ایک قسم کی مادی یادداشت تھی۔ شعور، زبان اور تحریر کی صلاحیتیں پیدا کر لینے کے بعد کہیں جا کر یہ ممکن ہوا کہ انسان اپنی زندگی کے تجربے اور معلومات کو آنے والی نسلوں کو منتقل کرے۔ تعلیم دراصل اپنی معلومات کو آگے منتقل کرنے ہی کا نام ہے۔

ابتدائی انسان کی معلومات بہت سادہ تھیں اور ان کا تعلق زندگی کی بقا، زندگی کا تسلسل اور فطرت پر انحصار کی بجائے فطرت سے مقابلہ کرنے سے تھا۔ آگ جلانا، آلات بنانا، پھر زرعی دور میں اس کی معلومات کا دائرہ وسیع ہو گیا۔

علم عربی زبان کا لفظ ہے۔ علم کا مطلب ہے جاننا۔ لیکن اس جاننے میں ایک بہت ہی اہم نکتہ یہ ہے کہ یہ جاننا اس وقت علم بنتا ہے جب وہ یقین کے درجے تک پہنچ جائے۔ اگر یہ جاننا یقین کے درجے تک نہ پہنچے تو یہ ظن، قیاس، تعصب، وہم، گمان، اندازہ یا خود ساختہ تصور ہو سکتا ہے جبکہ خود ساختہ تصورات اور جذباتی عقیدت مندیاں علم کی تعریف کے زمرے میں نہیں آتے۔

Sanjh Lok Raj

معلومات غلط بھی ہوسکتی ہیں اور صحیح بھی۔ بہر حال ہم دونوں ہی قسم کی معلومات کو علم سمجھ کر مطمئن ہونے کے عادی ہیں۔معلومات کو حاصل کرنے کا بہت انحصار اس طریقہ کار پر بھی ہے جس کو استعمال کر کے ہم معلومات تک پہنچتے ہیں۔اور معلومات کے غلط یا صحیح ہونے کا انحصار بھی زیادہ تر ان ذرائع پر ہے جن کو معلومات حاصل کرنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔علم کیا ہے اور علم کن ذرائع سے حاصل کیا جاتا ہے؟ ان دونوں سوالوں پر بحث کو (Epistemology) کہتے ہیں۔ اس سے حاصل ہونے والے نتائج کو نظریہ تعلیم کہا جاتا ہے۔ایسا جاننا جس کو علم کہتے ہیں اور ایسا جاننا جسے ہم روزمرہ کی زندگی میں جاننا سمجھتے ہیں ان دونوں میں بڑا فرق ہے۔جاننے کے اس فرق کو واضح کر کے ہم اس مغالطے سے نکل سکتے ہیں کہ علم کیا ہے اور قیاس کیا ہے۔

1۔ فرض کریں آپ سڑک کے کنارے اپنے کسی دوست سے باتیں کر رہے ہیں اور ایک انجان شخص آپ کے قریب سے گزرتا ہے آپ اپنے دوست سے پوچھتے ہیں کہ یہ کون ہے؟ وہ آپ کو بتاتا ہے کہ یہ چور ہے۔بس آپ جان گئے کہ جو شخص آپ کے قریب سے گزرا تھا وہ چور ہے۔ اگلے ہی دن آپ کو پتہ چلتا ہے کہ وہ شخص تو ایک معزز شہری ہے۔اس شخص کے معزز شہری ہونے کا آپ کو پتہ نہ بھی چلتا تب بھی اپنے دوست کے کہنے پر یہ جاننا کہ وہ شخص چور ہے۔کیا ایسا جاننا ہے جس کو ہم علم کہہ سکیں؟

2۔ میں جس علاقے میں رہتا ہوں پنجاب بھر کے زیادہ تر گاؤں کی طرح یہاں بھی بارشوں کے موسم میں ایک مقامی بزرگ کا سالانہ کلچرل میلہ لگتا ہے۔جس میں کبڈی، کتوں کی لڑائی، شراب جواء ڈانس غرضیکہ کسی بھی غیر شرعی کام پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ میلے کے تین دنوں میں کسی ایک دن بارش بھی ہو جاتی ہے جس سے میلے کے شرکاء کو گرمی سے راحت ملتی ہے۔علاقے کے سبھی لوگ نسل در نسل یہی سنتے آئے ہیں کہ بادل بھی دوسرے عقیدت مندوں کی طرح اپنی حاضری بھرنے آتے ہیں۔ اس طرح نسل در نسل یہ بات لوگوں تک پہنچتی رہی ہے کہ چلچلاتی دھوپ میں کالی گھٹائیں اور ٹھنڈی ہوائیں میلے میں شرکت کرنے والوں کو راحت

Sanjh Lok Raj

پہنچانے آتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ میلے کو بارش ہونے کے سبب کے طور پر جاننا اور نسل در نسل جاننا کیا ایسا جاننا ہے جس کو ہم علم کہہ سکتے ہوں؟

3۔ کیمسٹری کا علم سائنس کے درجے کو نہیں پہنچا تھا اور قیاس کی وادیوں میں بھٹک رہا تھا۔ اس زمانے میں دھاتوں کے خواص کو عقلی اندازوں سے پہچانا جاتا تھا۔ اس زمانے کو (Age of Reason) کہتے ہیں۔ پھر ان عقلی اندازوں کو عقلی دلائل سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ تجربی تصدیق کا ابھی تک رواج نہیں ہوا تھا۔ اس طریقہ کو جس میں اپنے عقلی اندازوں کو صرف عقلی دلائل ہی سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی جائے (Rationalism) کہتے ہیں۔ اس کی مثال ہے سونا اور چاندی۔ سونا چونکہ سورج کی طرح زرد ہوتا ہے اس لیے سونے کے ساتھ یہ خصوصیت منسوب کی گئی کہ سونا گرم ہوتا ہے۔ چاندی کیونکہ چاند کی طرح سفید ہوتی ہے اور چاندنی کی طرح ٹھنڈی۔ لہٰذا چاندی کے ساتھ یہ خصوصیت منسوب کی گئی کہ یہ ٹھنڈی ہوتی ہے۔ اس وقت کے طبیب یا اس زمانے کا علم پڑھے ہوئے آج کے طبیب مریضوں کو چاندی کا کشتہ کھلایا کرتے ہیں تاکہ جگر کی گرمی کو ٹھنڈک ملے اور دل کو اس ٹھنڈک سے تقویت ملے۔ آج بھی آپ نے مٹھائیوں پر چاندی کے ورق دیکھے ہوں گے اس کے پیچھے یہی سوچ کارفرما ہے۔ سوال یہ ہے کہ دھاتوں کے خواص کو اس طرح جاننا کیا ایسا جاننا ہے جس کو علم کہا جا سکے؟

4۔ ایک زمانہ تھا جب انسان سمندری راستے تو استعمال میں لاتا تھا مگر سمندر کے دوسرے پار کسی براعظم پر نہیں گیا تھا۔ اس زمانے میں پیدا ہونے والے ایک مذہب کی مقدس کتاب میں لکھا ہے کہ ابتدا میں ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ پھر اس پر زمین کو تیرایا گیا۔ حالانکہ اس مذہب کے کروڑوں پیروکار ساری زندگی دیکھتے رہتے ہیں کہ مٹی کا ایک چھوٹا سا ڈھیلہ پانی پر تیرنے کی سکت نہیں رکھتا۔

سوال یہ ہے کہ کائنات کے بارے میں ایسا جاننا۔ علم کہلا سکتا ہے؟ یا یوں کہہ لیجیے کہ کیا عقیدے کو علم کہا جا سکتا ہے؟

Sanjh Lok Raj

ہم جس معاشرے میں رہتے ہیں یہاں کے کلچرل اور مذہبی تعصّبات کو بھی علم ہی سمجھتے رہتے ہیں۔ ان تعصّبات کو علم کی روشنی سمجھ کر پھیلانا اپنی زندگی کا بنیادی مقصد سمجھتے ہیں۔ جیسے اونچی اور نیچی ذات کا تعصب، فرقہ واریت کا تعصب، دوسرے مذاہب کے پیروکاروں کو گھٹیا سمجھنے کا تعصب، عورت کو کم تر انسان سمجھنے کا تعصب وغیرہ۔

شعور، زبان اور تحریر کی طرح علم بھی انسان ہی کی تخلیق ہے۔ لیکن انسان نے جو علم تخلیق کیا ہے وہ دو طرح کا ہے۔ علم صرف دو ہی طرح کا اس لیے ہے کہ انسان نے علم کو تخلیق کرنے کے دو ہی طریقے اختیار کیے ہیں۔ دو الگ الگ راستوں پر چل کر سچائی کو تلاش کیا ہے دنیا و مافیہا کو جاننے کے لیے دو الگ ذرائع استعمال کیے ہیں۔ اس وجہ سے ان طریقوں کی بنیاد پر ہی ہم نے علم کو دو قسموں میں بانٹا ہے۔ یہ بحث (Epistemology) کہلاتی ہے۔ ایک طریقۂ مابعدالطبیعاتی طریقہ کہلاتا ہے اور دوسرا سائنسی طریقہ۔ لیکن حقیقت میں انسان نے علم کے بارے میں جو نظریئے قائم کیے ہیں ان کے مطابق ہم انہیں مابعدالطبیعاتی نظریہ علم اور سائنسی نظریہ علم کہیں گے۔

Sanjh Lok Raj

مابعدالطبیعاتی طریقہ

ایک زمانہ تھا جب ساری دنیا انسان کے لیے راز تھی۔ بنی نوع انسان اتنی لاچار تھی کہ لوگوں کو یہ تک پتہ نہیں چلتا تھا کہ رات کے بعد دن ہوگا اور سردیوں کے بعد گرمیاں آئیں گی۔ قدیم زمانے کے لوگ اس لیے مذہبی عبادتیں کرتے تھے کہ سورج آسمان سے بلند ہو۔ مصر کے فرعون جو زمین پر سورج کا اوتار سمجھا جاتا تھا ہر روز مندر کے گرد ایک چکر لگاتا تھا کہ سورج اپنا روزانہ کا ایک چکر پورا کرے۔

اردگرد کی دنیا کا راز ہونا ابتدئی انسان کے لیے ایک انجانے سے خوف کا باعث تھا۔ یہ خوف وسوسے بھی پیدا کرتا تھا۔ ایسی صورتِ حال میں جب انسان اپنے اردگرد کی دنیا کو جاننے کی ابتدا کر رہا تھا۔ قیاس ہی وہ ذریعہ تھا جس سے اس نے جاننے کی ابتدا کی۔

قیاس کے بیج سے انسانی خیالات کی سرزمین میں جو پودا اگا وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس پودے میں خودساختہ تصورات کے پتے اور شاخیں نکلتے رہے۔ ایک مدت گزرنے کے بعد یہ پودا نشوونما پا کر ایک درخت بن گیا۔ اس درخت کو مابعدالطبیعات کا پھل لگا۔

مابعدالطبیعات کے ایک باقاعدہ نظریہ کی شکل اختیار کرنے کا عمل ایسا ہے جیسے ایک بچہ ماں کے پیٹ میں بے ڈھنگی شکلیں بدلتا ہوا آخر 9 ماہ کی مدت کے پورا ہونے پر خوبصورت تراش خراش کے نین نقش لے کر پیدا ہوتا ہے۔ مابعدالطبیعات کے باقاعدہ نظریہ کو (Idealism) کہتے ہیں۔ لیکن یہاں ہم مابعدالطبیعات کو دنیا کو جاننے کے ایک طریقے کے طور پر پڑھ رہے ہیں۔ یعنی اس کو ذریعۂ علم کے طور پر پڑھ رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں مابعدالطبیعات کے ایک باقاعدہ نظریہ تک پہنچنے کے ہر مرحلے سے واقفیت حاصل کرنی ہے۔

جب سے انسان کے دماغ میں سوچنے سمجھنے اور یادداشت رکھنے کے خلیئے پیدا

Sanjh Lok Raj

ہوئے ہیں تب سے انسانی دماغ کسی ایک لمحے کے لیے بھی خیالات سے خالی نہیں ہوتا۔ نہ جاگتے ہوئے نہ سوتے ہوئے۔ فرق یہ ہے کہ جو خیالات سوتے ہوئے ہمارے دماغ میں چلتے رہتے ہیں اگر وہ ہمیں یاد رہ جائیں تو انہیں خواب کہتے ہیں۔ یہ خواب ابتدائی انسان کے لیے بڑی حیرت و تشویش کا باعث تھے۔ ابتدائی انسان جب خواب میں خود کو مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہوا دیکھتا تھا۔ کبھی دوستوں سے باتیں کرتا ہوا کبھی شکار کی منصوبہ بندی کرتا ہوا۔ دور دراز علاقوں میں گھومتا پھرتا تو کبھی درندوں سے مقابلہ کرتا ہوا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ جاگ جانے پر وہ خود کو اسی جگہ پر پاتا جہاں وہ سونے سے پہلے موجود تھا۔ ابھی تک اسے یہ تو پتہ نہیں تھا کہ خواب کا سارا عمل اس کے دماغ کے اندر ہی مکمل ہوا ہے۔ اس کے اُلٹ اس نے اس تجربے سے یہ تصور قائم کیا کہ اس کے جسم میں کوئی ایسی چیز موجود ہے جو جسم سے الگ ہو جاتی ہے۔ وہ ایسی چیز ہے جو سوچتی، سنتی، بولتی، سمجھتی بوجھتی، دوستی اور دشمنی کے جذبات رکھتی ہے۔ جب وہ عارضی طور پر انسان کے جسم سے الگ ہوتی ہے تو انسان سو جاتا ہے اور جب وہ مستقل طور پر انسان کے جسم سے الگ ہوتی ہے تو انسان مر جاتا ہے۔ جب انسان مر جاتا تھا تو اس کی واضح نشانی یہ ہوتی تھی کہ اس کی سانس بند ہو جاتی تھی۔ اس لیے اس نے انسان کے جسم سے الگ ہونے والی قیاسی چیز کا نام رکھا روح (عبرانی) سائیکی (یونانی) آتما (سنسکرت) اینے ما (لاطینی)۔ ان تمام الفاظ کا مطلب ہے سانس اور ہوا کا جھونکا۔ اس طرح قیاس کے بیج سے روح کے تصور کا پودا پھوٹا۔

پھر جب ابتدائی انسان خواب میں ان لوگوں سے ملتا تھا جو بہت پہلے مر چکے ہوئے تھے ان کے جسم گل سڑ گئے ہوئے تھے تو ایسے خواب سے اس کے ذہن میں یہ بات آتی تھی کہ وہ جن لوگوں سے خواب میں ملا ہے وہ دراصل ان لوگوں کی روحیں ہیں۔ اس طرح ایک تو اس کے روح کے تصور کی تصدیق ہو جاتی تھی دوسرے وہ یہ نتیجہ اخذ کرتا تھا کہ روح کو موت نہیں۔ روح لافانی ہے۔ اس تصور کو بقائے روح کا تصور کہتے ہیں۔

شکار کی زندگی میں انسان خود شکار کی تلاش میں مارا مارا پھرتا تھا اس لیے روح کے بارے میں بھی اس کا تصور یہی تھا کہ روحیں اس کے آس پاس ہی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ پتوں کی سرسراہٹ پر بھی اسے روح کا گمان ہوتا تھا۔ یہ روحیں اس کے بزرگوں اور دوستوں کی

Sanjh Lok Raj

بھی تھیں اور اس کے دشمنوں اور درندوں کی بھی۔ یہاں تک کہ پہاڑ، دریا، درخت وہ ہر چیز کو اپنی طرح کا ذی روح سمجھتا تھا۔

وہ اپنی زندگی میں دیکھتا رہا تھا کہ انسان اچھے بھی ہوتے ہیں اور برے بھی۔ ظاہر ہے یہ اچھے یا برے اپنے مادی جسموں کی وجہ سے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کی روحیں اچھی یا بری تھیں۔ اپنی اچھی یا بری روحوں ہی کی وجہ سے لوگ اچھے یا برے تھے۔ اس لیے روحیں دو قسم کی ہیں نیک روحیں اور بدروحیں۔ نیک روحیں انسان کے لیے باعث راحت تھیں اس کے قیاس کے مطابق وہ اس کی مدد کرتی تھیں اس کی حفاظت کرتی تھیں۔ اچھے مشورے دیتی تھیں یہ روحیں اس کے بزرگوں کی یا نیک لوگوں کی تھیں۔ بدروحیں اس کے قیاس کے مطابق اس کو نقصان پہنچانے کے درپے رہتی تھیں۔ اس کو جب بھی کوئی ناکامی ہوتی یا نقصان پہنچتا وہ یہی سمجھتا تھا کہ یہ بدروحوں کا کام ہے۔

کائنات کی نیک روحوں اور مظاہر فطرت کو اپنے اوپر مہربان رکھنے کے لیے اس نے مناسب خیال کیا کہ ان کے ساتھ بھی ویسا ہی سلوک کیا جائے جیسا سلوک کیے جانے پر وہ خود خوش ہوتا اور دوسروں پر مہربان ہوتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اپنی تعریف سن کر دوسرں سے تحفے وصول کر کے، دوسروں کو اپنے سامنے جھکا ہوا اور تابع فرمان دیکھ کر خوش ہوتا ہے چنانچہ اس نے مظاہر فطرت اور نیک روحوں کو خوش کرنے کا یہی طریقہ اپنایا۔ اس نے ان کی شان بیان کرنے کے لیے گیت بنائے۔ انہیں کھانے پینے کی چیزیں پیش کیں۔ اپنے آپ کو ان کے آگے جھکا دیا۔ بدروحوں کے شر سے بچنے کے لیے اس قسم کے کام اور حرکتیں کیں جو وہ اپنے دشمنوں کو بھگانے اور خود سے دور رکھنے کے لیے کیا کرتا تھا۔ شروع شروع میں تو یہ سارے کام انسانوں کے قبیلے اجتماعی طور پر ادا کرتے تھے۔ مگر بعد میں گروہ میں سے ایک فرد جو بالعموم کوئی بزرگ یا دانا شخص ہوا کرتا تھا پورے گروہ کی نمائندگی کرنے لگا۔

یہ فرد قبیلے کی طرف سے نیک روحوں اور مظاہر فطرت کے آگے نذریں پیش کرتا۔ ان کو قبیلے کی فرمانبرداری کا یقین دلاتا۔ اس کو پیشوا بھی کہتے تھے مگر یہ فرد طبیب بھی تھا۔ جادوگر بھی اور معلم بھی۔

یہ شخص گروہ کے اندر امتیازی وصف رکھنے والا مانا جانے لگا۔ یہ ایسے منصب پر فائز تھا

جو عام لوگوں کی نظر میں ان سے بلند تھا۔ وہی جانتا تھا کہ مظاہر فطرت اور نیک روحوں کو کس طرح مہربان کرنا ہے۔ قبیلے کے لوگوں سے کس قسم کی قربانی لے کر انہیں بدروحوں کے شر سے بچانا ہے۔کون کون سی رسمیں کن وقتوں میں ادا کرنی ہیں۔ اور کون کون سا منتر کس طرف منہ کر کے پھونکنا ہے۔کس بیماری میں کس چیز کی دھونی دینی ہے۔ پیدائش شادی اور موت پر کون سی رسمیں ادا کرنی ہیں۔ یہ دور انسانی تاریخ میں جادو کا دور کہلاتا ہے۔اسے شمن ازم بھی کہتے ہیں۔

قدیم عراق کا شہر بابل جادو کا مرکز تھا۔ ہندوؤں کی کتاب اتھروید میں جو منتر اور ٹوٹکے درج ہیں ان کے متعلق تحقیق سے معلوم ہوا ہے کہ وہ آریاؤں کی آمد سے قبل کے ہندوستانی مقامی باشندوں یعنی دراوڑوں سے لیے گئے ہیں۔ چین میں لی چنگ نامی جادو کی کتاب کنفیوشس سے بھی کئی صدیاں پہلے لکھی گئی تھی۔ مصر کے منتر اور ٹوٹکے پر مشتمل جادو کی کتاب ''مردگان'' تین ہزار سال قبل مسیح کی ہے۔ بنگالی بابا اور کالے جادو کے اشتہارات جو آپ آج کل بھی دوپہر کے اخباروں میں پڑھتے ہیں یا نجی چینلوں پر مارننگ شوز میں دیکھتے ہیں اسی دور کی یاد ہیں۔صدیوں پر صدیاں گزر گئیں انسان نے زراعت کو زندگی گزارنے کے ذریعے کے طور پر اختیار کر لیا۔ خانہ بدوشی ترک کر کے بستیاں بسا لیں۔تجارت ہونے لگی۔ بحری سفر شروع ہو گیا۔ پیشواؤں نے مظاہر فطرت اور روحوں کو دیوی دیوتاؤں میں ڈھالا۔ اپنے تخیل سے ان کے مجسمے بنائے دیوتاؤں کے ان مجسموں کو معبدوں میں رکھا۔ ان کے سامنے نذریں اور قربانیاں پیش کرنے کو کہا ان دیوتاؤں کے بارے میں داستانیں وضع کیں۔ پہلے پہل کی کہانیوں کے مطابق یہ دیوتا انسانوں کی طرح ہی زندگی گزارتے تھے۔ وہ نیک بھی تھے اور برے بھی۔ ظالم بھی تھے رحمدل بھی۔ وہ نیکیاں بھی کرتے تھے جرائم بھی۔ یہ دیوتا پاکباز بھی تھے اور جنسی بے راہروی کا ارتکاب بھی کرتے تھے۔ یہ دیوتا شادی بھی کرتے تھے ان کی اولادیں بھی ہوتی تھیں۔ یہ آپس میں پیار بھی کرتے تھے لڑائیاں بھی۔ ان سب کے باوجود انسان کی طرح فانی نہیں تھے۔

عراق ہو یا لبنان، مصر ہو یا یونان، ہندوستان ہو یا چین، دنیا کے ہر خطے میں تخلیق کائنات، انسان، مظاہر فطرت کی وضاحت دیوی دیوتاؤں کے متعلق داستانوں سے کی گئی۔ یہ داستانیں دیومالا، اساطیر یا (Mythology) کہلاتی ہیں۔صدیوں پر محیط اس اجتماعی تخلیقی عمل

Sanjh Lok Raj

کے تسلسل کا نتیجہ وہ اساطیری قصے اور دیو مالائی کہانیاں ہیں جنہیں پروہتوں نے اپنے تخیل سے گھڑا۔ ان داستانوں میں اتنی رنگینی پیدا کی کہ لوگ ان پر من وعن یقین لے آئے۔ لوگ عملی زندگی میں ان داستانوں سے رہنمائی حاصل کرتے تھے ان کا ایمان تھا کہ یہ کائنات دیوتاؤں نے بنائی ہے یہ دیوتا ہی تھے جنہوں نے روئے زمین پر انسان کو پیدا کیا اور ان کی تقدیریں ان کی پیدائش سے پہلے ہی معین کر دیں۔

انسانی سماج کی ترقی کے ایک مرحلے تک تو روحیں، دیوتا اور انسان ایک ہی دنیا میں رہتے تھے۔ جیسے جیسے سماج آگے بڑھ رہا تھا۔ انسان نے پہاڑوں کے پار دیکھ لیا تھا۔ دریا عبور کر لیے تھے سمندروں سے ہولیا تھا۔ تجارت کے ذریعے دور دراز کے علاقوں کو ایک دوسرے سے جوڑ لیا تھا دیوتاؤں کے بارے میں انسان کا تجسس بڑھ رہا تھا کہ وہ کہاں ہیں؟ نت نئے سوالات پیدا ہو رہے تھے۔ اب کے ان سوالوں کے تخیلاتی اور قیاسی جوابوں سے پوری دنیا کے سوچنے سمجھنے کے ڈھنگ میں ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہونے والی تھی۔ یہ تھا دو دنیاؤں کا تصور۔ دوسری دنیا جہاں دیوتا رہتے تھے۔

سوال یہ تھا کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کی روح کہاں چلی جاتی ہے؟ جواب یہ تھا کہ وہ دوسری دنیا میں چلی جاتی ہے۔ جو عالم بالا ہے۔ دوسرا جہان ہے۔ اس طرح دو دنیاؤں کا تصور قائم ہوا۔ ظاہری دنیا اور باطنی دنیا۔

دو دنیاؤں کا تصور مذہب کے آنے سے صدیوں پہلے سے موجود تھا۔ ہڑپہ کی کھدائیوں میں پانچ ہزار سال قبل کا ایک قبرستان دریافت ہوا ہے۔ جس میں لوگوں کی قبروں سے ان کے روزمرہ ذاتی استعمال کی چیزیں بھی ملی ہیں، کھانے پینے کی چیزیں اور برتن۔ پانی کا مشکیزہ وغیرہ کے قبروں سے ملنے سے ماہرین کا خیال ہے کہ ہڑپہ کے لوگ دوسرے جہان پر یقین رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مرنے والے کو اگلے جہان کھانے پینے کی چیزوں اور روزمرہ کے استعمال کی دوسری چیزوں کے حصول میں کوئی پریشانی نہ ہو۔ حالانکہ اِسی ہڑپہ سے کسی بھی عبادت گاہ کا کوئی نشان نہیں ملا۔

خاص مادی حالات میں سماجی ترقی کے ایک خاص مرحلے پر روح، بقائے روح، جادو کی رسمیں، دیوتا، دو دنیاں کا تصور اب مستقل ہو چکے پیشوائیت کے ادارے آپس میں ضم

Sanjh Lok Raj

ہوتے جا رہے تھے جس سے دنیا کے بڑے بڑے مذاہب نے جنم لیا۔ بقائے روح کا تصور اب حیات بعد موت کے تصور میں بدل گیا۔ جادو کی رسمیں اب عبادات اور مناسک میں تبدیل ہوگئیں۔ یہ مذاہب سابقہ تصورات کی اچھائیوں کا نچوڑ ضرور تھے مگر سابقہ تصورات سے کہیں ترقی یافتہ اور جدید۔

ان مذاہب نے مظاہر فطرت، کائنات کی ابتداء، انسان کا مقام اور ظاہری اور باطنی دنیا کے آپس کے تعلق کی نئی تشریح کی۔ دنیا و مافیہا کو جاننے کا ایک نیا طریقہ متعارف کروایا۔ ظاہری دنیا میں جو واقعات پیش آتے ہیں یا جو تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کی وجوہات باطنی دنیا میں ہیں۔ اس تصور کو ماورائیت کہتے ہیں۔

یہ تھا دنیا اور اس میں جو بھی کچھ ہے اس کو جاننے کا نیا ڈھنگ، ہر شخص ظاہری دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کی وجہ کو باطنی دنیا میں تلاش کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ یہ کام خاص لوگ ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔ اس لیے علم وہی ہے جو یہ خاص لوگ آپ کو بتاتے ہیں۔

دنیا کو جاننے کے ماورائی طریقے کا پہلا اصول یہ ہے کہ اس طریقے سے حاصل کیا گیا علم شخصی ہوتا ہے۔ ان کے مطابق عام لوگ ناقص ذہن کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ ظاہر پرست ہوتے ہیں۔ وہ خود تو باطنی دنیا تک رسائی حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوتے۔ یہ جوہر قدرت نے چند لوگوں کو عطا کیا ہے۔ کروڑوں اربوں لوگوں میں کوئی ایک شخص کئی صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے جو دانائے راز ہوتا ہے۔ وہ ظاہری دنیا میں رونما ہونے والے واقعات تبدیلیوں اور حادثات کی وجوہات کی معلومات کو باطنی دنیا سے حاصل کرتا ہے اور لوگوں کو بتاتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر کسی کامل ذہن سے یہ پوچھا گیا کہ زلزلہ کیوں آتا ہے؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ جب لوگ اپنے خدا کو بھول جاتے ہیں تو خدا اپنی یاد دہانی کروانے کے لیے زلزلہ بھیجتا ہے۔ اب ناقص ذہن اگر اس جواب پر شک کرے یا انکار کر دے تو یہی تو اس کے ذہن کے ناقص ہونے کا ثبوت ہے کہ اس نے اتنی بڑی حقیقت پر شک کیا۔

یہ بات لکھتے ہوئے مجھے اپنی طالب علمی کا ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ ہوسٹل میں میرے ساتھ کمرے میں رہنے والا طالب علم فلسفہ میں ایم اے کر چکا تھا۔ اس کے والدین اسے اپنے ایک خاندانی پیر کا مرید کروانا چاہتے تھے۔ پیر صاحب سے ایک ملاقات میں

Sanjh Lok Raj

دورانِ گفتگو طالب علم نے یہ پوچھ لیا کہ چین کے لوگ پاکستان کے لوگوں سے زیادہ خوشحال کیوں ہیں حالانکہ ان کے بارے میں سنا ہے کہ وہ تو خدا کو بھی نہیں مانتے۔ اس پر پیر صاحب نے فرمایا کہ خدا اپنے ماننے والوں کو آزماتا ہے۔ انہیں مشکل میں رکھتا ہے کہ کہیں یہ مشکل وقت میں اپنے رب کو بھول تو نہیں جاتے؟ اس پر طالب علم نے پوچھا کہ آزمائش تو ایک ناقص ذہن کا کام ہے جو غیب کا علم نہیں رکھتا۔ خدا کو تو پتہ ہے کہ آزمائش کے بعد کسی شخص کا کیا ردعمل ہوگا۔ اس پر پیر صاحب نے فرمایا کہ انسان کے ذہن میں شیطان ایسے سوالات پیدا کرتا ہے۔ عقل کو استعمال کرنا شیطان کا عمل ہے۔ شیطان نے اپنی عقل کا استعمال کیا اور آدم علیہ السلام کو سجدہ نہیں کیا تو قیامت تک دھتکار دیا گیا۔

اس وقت دنیا میں مذاہب کی جتنی بھی قسمیں اور شکلیں موجود ہیں وہ اپنے تمام تر عقائد و نظریات اور تعلیمات و احکام کو انسانی فکر کے نتائج کے طور پر پیش نہیں کرتے بلکہ ان کو ماورائی ہستی یا ہستیوں کی دین کے طور پر پیش کرتے ہیں اس لیے یہ سب چیزیں مکمل، قطعی اور حرف آخر سمجھی جاتی ہیں۔ یہ مقدس ہوتی ہیں اور ان میں کسی ترمیم یا تنسیخ یا ردوبدل کی نہ تو گنجائش ہوتی ہے نہ اجازت۔ یہ وہ بنیادی خدوخال ہیں جس کو سمجھ کر ہم اس سے اگلی منزل یعنی جاننے کے مابعدالطبیعاتی طریقہ تک پہنچیں گے۔

مذاہب نے اپنے آغاز سے لے کر اپنی ارتقائی شکل تک علم کی ایک خاص سطح کو اپنا لیا۔ اسی کو اپنا حوالہ بنالیا جو ایک وقت تک قائم ہو چکی تھی۔ روح کا تصور، بقائے روح، نیک و بد روحیں، جادو کی رسمیں، منتر، دو دنیائیں، مائتھالوجی یہ سب کچھ افلاطون سے صدیوں پہلے سے موجود تھا۔ یہی وہ تصورات تھے جن کے یکجا ہونے سے عالمی مذاہب کا ظہور ہوا۔ افلاطون نے بھی عین انہی تصورات کو یکجا کیا مگر کسی مذہب کی بنیاد نہیں رکھی بلکہ اس کو ایک عمومی نظریہ کی شکل دی۔ اس نے جو کچھ بھی کہا اس کو اپنی سوچ اور اپنی ذاتی فکر کے نتائج کہہ کر پیش کیا۔ اس نظریہ کو تصوریت، عینیت، مثالیت یا (Idealism) کہتے ہیں۔ بس روح کا لفظ استعمال کرنے کی بجائے اس نے امثال (Form) کا لفظ استعمال کیا۔ امثال بھی روح کی طرح ازلی وابدی ہیں۔ افلاطون کے مطابق یہ دنیا ظاہر کی دنیا ہے۔ ظاہر نظر کا دھوکا، عقل کا فریب اور بے حقیقت ہے۔ ظاہری دنیا کا از خود کوئی وجود نہیں۔ جیسے کوئی شخص شیشے کے سامنے کھڑا اپنا عکس

Sanjh Lok Raj

دیکھ رہا ہو۔ اس میں حقیقی وجود شخص کا ہے اور عکس ایک بے وجود اور بے حقیقت شے ہے۔ اسی طرح افلاطون کے نزدیک حقیقی وجود عالم باطن کا ہے۔ امثال حقیقی وجود رکھتی ہیں اور ظاہری دنیا کی مادی چیزیں ان امثال کا عکس ہیں۔ اس لیے حواس کے ذریعے حقیقت نہیں پہچانی جا سکتی کیونکہ حواس تو صرف مادی چیزوں کا ادراک کر سکتے ہیں۔ لیکن امثال کا ادراک یا حقیقت کو پہچاننے کی صلاحیت چند مخصوص لوگ رکھتے ہیں جو ذہن کامل کہلاتے ہیں۔ یہ مخصوص لوگ ہی حکومت کرنے کے مستحق ہوتے ہیں۔ دنیا کے تمام مذاہب کو افلاطون کے نظریہ مثالیت نے بہت طاقت بخشی۔ مثالیت اور مذاہب میں بنیادی اتفاق اسی بات پر ہے کہ عالم ظاہر میں ہونے والی تبدیلیوں کو مظاہر کو سمجھنے کے لیے عالم باطن سے راہنمائی حاصل کرنی چاہیے اور یہ راہنمائی کوئی کامل شخص ہی دے سکتا ہے۔

ارسطو نے فلسفے، سائنس، سیاسیات اور دیگر موضوعات پر جو مضامین لکھے تھے ان میں ایک مضمون کا عنوان(First Philosophy) تھا۔ ان مضامین کو جب(Andromicus) نے ترتیب سے جوڑ کر ارسطو کی کلیات مرتب کی تو(First Philosophy) کا مضمون عین طبیعات کے مضمون کے بعد رکھا۔ طبیعات میں مادے کے قوانین سے بحث کی گئی تھی جبکہ (First Philosophy) میں غیر مادی، تخیلاتی، روحانی اور قیاسی چیزوں پر بحث تھی۔ ان میں بھی مادی دنیا پر باطنی دنیا کی حاکمیت بیان کی گئی تھی۔ اس طرح اب یہ مضمون مابعدالطبیعات کہلانے لگا۔ کیونکہ یونانی زبان میں(Meta) کا مطلب ہے بعد میں۔

سترھویں صدی میں مابعدالطبیعات میں دیگر ایسے مضامین بھی شامل کر لیے گئے جن کا تعلق ایسی چیزوں سے تھا جو مادی وجود نہیں رکھتیں۔ اس وجہ سے مشاہدے میں نہیں آ سکتیں۔ جیسے زمان و مکان، اخلاقیات و اقدار، جمالیات و روحانیات وغیرہ۔ کچھ لوگ مابعدالطبیعات اور ماورائیت کو بھی فلسفہ کہتے ہیں جو سراسر پیچیدگی اور ابہام پیدا کرنے کی کوشش ہے۔ البتہ مابعدالطبیعات ایک نظریہ ہے یہ وہ پھل ہے جو قیاس کے بیج سے پیدا ہونے والے درخت پر لگتا ہے۔

پاکستان کی تمام سرکاری اور پرائیویٹ یونیورسٹیوں کی ایم ایڈ اور بی ایڈ کی نصابی کتب میں مابعدالطبیعات کا ترجمہ علم الحقیقت کیا جاتا ہے۔ اس لیے پاکستان کے تعلیمی نظام کو

Sanjh Lok Raj

سمجھنے کے لیے دنیا کو جاننے کے مابعدالطبیعاتی طریقہ کو سمجھنے کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ یہ بحث(Epistemology) کا حصّہ ہے جسے نظریۂ تعلیم کہا جاتا ہے یعنی ہم پاکستان میں موجود تعلیمی نظام کے نظریہ کو سمجھنے کے لیے مابعدالطبیعات کے چند ابتدائی مفروضات کو دہراتے ہیں۔ یاد رہے ہم جن نکتوں کو مفروضہ کہتے ہیں۔ مابعدالطبیعاتی نظریہ علم پر یقین رکھنے والوں کے نزدیک یہ مفروضات نہیں بلکہ حقائق ہیں۔

1۔ یہ دنیا جو ہمارے سامنے ہے یہ مادی دنیا ہے۔ یہ دنیا نظر کا فریب ہے دھوکا ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ یہ حقیقی دنیا کا جو عالم باطن ہے اس کا عکس ہے۔ یہ ناپائیدار اور عارضی ہے۔ اس کا وجود پانی کے بلبلے سے زیادہ کچھ نہیں جو کسی وقت بھی از خود ختم ہو سکتا ہے یہ دنیا جلد فنا ہو جائے گی۔

2۔ مادی دنیا میں کوئی اصول یا ضابطہ کارفرما نہیں۔ یہاں جو کچھ بھی رونما ہوتا ہے وہ عالم باطن کے ریموٹ کنڑول سے ہوتا ہے۔ پتھر پانی میں ڈوب جاتا ہے مگر کسی صاحب کمال کے کہنے پر پانی پر تیر بھی سکتا ہے۔ پانی ڈھلوان کی طرف بہتا ہے مگر یہ بات کوئی اصول نہیں ہے کسی کے پاس روحانی طاقت ہو تو وہ دریا کو پہاڑ پر چڑھا کر دوسری طرف اتار بھی سکتا ہے۔ سورج وقت پر نکلتا اور غروب ہوتا ہے مگر اسے وقت پر نکلنے سے روکا بھی جا سکتا ہے۔ مادی دنیا کی کسی چیز پر یقین نہیں کیا جا سکتا کہ کیا ہو جائے گا۔ یہاں کسی چیز کے بارے میں کوئی بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی۔ ہر چیز(Unpredictatble) ہے۔

3۔ دنیا و کائنات ازل سے ابد تک ایک مکمل وجود ہے۔ اس میں کبھی کوئی تبدیلی نہیں آتی۔ تبدیلی وارتقا نظر کا دھوکا ہے۔ انسانی شعور، زبان، تحریر و علم سب روح کا عمل ہے۔ روح چونکہ ازل سے ہے ابد تک رہے گی اس لیے علم بھی ازل سے ابد تک روح کا حصّہ ہے۔ علم سینے میں بند ہوتا ہے اگر کسی طریقہ سے سینہ روشن ہو جائے تو علم انسان کے اندر ہی موجود ہے۔ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ جو کچھ ازل سے جیسا پیدا کیا گیا ہے ابد تک ویسا ہی رہے گا ان کے مطابق آسمان کے نیچے کچھ نیا نہیں۔ آنے والا کل پہلے سے طے شدہ ہے اور ناقابل تغیر ہے۔

Sanjh Lok Raj

4۔ انسان کا ذہن ناقص ہے وہ علم حاصل نہیں کر سکتا۔ کیونکہ انسان کا ذہن مشاہدے پر یقین کرتا ہے جبکہ حقیقت مشاہدے میں نہیں آ سکتی۔ حقیقت تک پہنچنے کے لیے دل کو پاک کرنا پڑتا ہے پھر کچھ رسومات ادا کر کے آنکھیں بند کر کے مراقبہ کیا جائے تو حقیقت دل پر منکشف ہو سکتی ہے۔

مابعدالطبیعات اور مابعدالطبیعاتی نظریہ علم کی بنیاد موضوعی سوچ ہے۔

Sanjh Lok Raj

موضوعی اور معروضی خیالات

موضوع کا لفظ وضع سے نکلا ہے۔ وضع کرنے کا مطلب ہے اپنی طرف سے بنانا۔ جیسے اصول وضع کرنا۔ وضع کا دوسرا مطلب ہے پیدا کرنا۔ ان معنوں کی نسبت سے ایسے خیلات وتصورات، آراء وتجزیئے جو ہم اپنی طرف سے بناتے ہیں انہیں موضوعی کہا جاتا ہے۔

''اپنی طرف سے'' کے الفاظ کو ذہن میں رکھ کر ہم اس کی وضاحت چند مثالوں سے کریں گے۔ آپ کو راستے میں جاتے ہوئے ایک سنہری انگوٹھی ملتی ہے۔ آپ اپنی طرف سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ سونے کی ہے۔ مگر جب کبھی آپ یہ انگوٹھی کسی سنار کو چیک کرواتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ انگوٹھی سونے کی نہیں ہے۔ آج آپ کا رزلٹ آ رہا ہے اور آپ رزلٹ کا پتہ کرنے باہر جا رہے ہیں۔ مگر ٹھہریئے۔ آپ کے دل میں یک دم خیال آتا ہے کہ آپ پچھلی بار اس گلی سے گزر کر رزلٹ کا پتہ کرنے گئے تھے اور فیل ہو گئے تھے اس بار کسی دوسری گلی سے جایئے۔ اپنے فیل ہونے کی وجہ کو اپنی طرف سے کسی خاص گلی سے گزرنے پر قیاس کرنا موضوعی ہے۔ موضوعی خیال آپ کا اپنا وہم یا گمان ہوسکتا ہے۔

''اپنی طرف سے'' کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ آپ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں۔ بلکہ ایسا آپ کے جذبات احساسات، خواہشات اور مفادات کے تابع ہو جاتا ہے۔ اس لیے موضوعی خیال سے مراد ایسے تصورات ہیں جو ہم اپنی طرف سے اپنے جذبات، تعصّبات اور مفادات کے تابع قائم کرتے ہیں۔ آپ کو کون سا رنگ پسند ہے؟ کھانے میں آپ کو کیا اچھا لگتا ہے؟ کیسے لوگوں سے آپ دوستی رکھنا چاہتے ہیں؟ شادی کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ اس طرح کی کئی دوسری چیزیں جن کا تعلق صرف آپ کی ذات سے ہے یہ ہمیشہ آپ کی ذاتی پسند، ناپسند پر منحصر ہے اور یہ ہمیشہ ہی موضوعی ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے آپ کی

Sanjh Lok Raj

اپنی ذات سے متعلقہ ذاتی پسند پر آپ کا حق پوری دنیا میں تسلیم کیا جاتا ہے مگر کچھ خیالات ایسے ہیں جو آپ کی ذات سے نکل کر دوسرے لوگوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ یہ تصورات معاشرتی تصورات کہلاتے ہیں۔ مگر معاشرتی تصورات کو بھی زیادہ تر ہم اپنے جذبات کے تابع قائم کرتے ہیں۔

اگر معذوروں کو حقارت اور رحم کی نظروں سے دیکھنے کی بجائے آپ عام انسانوں کے برابر حق دینے کے اس لیے حامی ہیں کہ آپ کا اپنا بھائی معذور ہے۔ اگر ہم عورتوں کے حقوق کے اس لیے مخالف ہیں کہ ہم اپنی بہنوں، بیٹیوں کا مردوں کے ساتھ بیٹھنا پسند نہیں کرتے تو ہمارے یہ خیالات موضوعی ہیں۔ ہم نے جائز حقوق کے نام پر عالمی سطح پر مانے گئے عورتوں کے حقوق کو اپنی مرضی کے تابع کر دیا ہے۔

سپورٹس مین سپرٹ کے بارے میں آپ نے سنا ہوگا کہ کھیل لوگوں میں ہار جیت سے متعلق برداشت کا جذبہ پیدا کرتے ہیں۔ صلاحیتوں کی بنیاد پر فتح حاصل کرنے والے کو سراہا جانا اس کی صلاحیتوں کا اعتراف ہے اور ہارنے والے میں کوشش کر کے جیت کا جذبہ پیدا کرنا سپورٹس مین سپرٹ ہے۔ مگر جب ہندوستان اور پاکستان یا دنیا میں کہیں بھی دو مخالف ملکوں کی ٹیموں کے درمیان میچ ہوتا ہے تو لوگ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ پاتے ہمارے ہاں تو یہ کفر اور اسلام کی لڑائی بن جاتی ہے۔

الیکشن میں بھی ایسا ہوتا ہے کہ آپ اپنی پسند کے امیدوار کے حق میں خود کو دوسروں سے اتنا الگ تھلک کر لیتے ہیں کہ آپ کو بس اپنے ہی امیدوار کی کامیابی نظر آ رہی ہوتی ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ امیدوار کی کامیابی سے متعلق اپنی طرف سے ایسے ایسے دلائل بنا لیتے ہیں اور لوگوں سے توقع کرتے ہیں کہ لوگ آپ ہی کے دلائل سے اپنے نتیجے بھی اخذ کریں۔ لوگ آپ کے انہی دلائل کو سن کر ہی آپ کی وابستگی کا اندازہ بھی لگا لیتے ہیں۔

ہمارے ہاں سیاست بھی موضوعی ہوتی ہے۔ سیاست میں کسی پروگرام یا منشور کو آگے بڑھانے کی بجائے پارٹی قائد کی شخصیت کو دنیا کے مسائل کا واحد حل بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے دنیا کے بڑے مذاہب میں مقدس ہستیوں سے وابستگی کو اگلے جہان میں نجات کا ذریعہ مانا جاتا ہے۔ اسی طرح ہمارے ہاں سیاسی قیادت سے وابستگی کو ملک کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی

مسائل کا حل سمجھا جاتا ہے۔لوگ بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ ہم بھٹو کے ماننے والے ہیں یا نواز شریف کے شیدائی ہی۔اس طرح پارٹیوں کے کارکن یہ سمجھتے ہیں کہ بھٹو خاندان کے کسی فرد کو یا نواز شریف کی فیملی کے کسی ممبر کو اقتدار میں لانا ہی ہمارے مسائل کا حل ہے۔

ہم اپنی پسند کے سیاسی لیڈروں کی غلطیوں کی بن مانگے صفائیاں پیش کرتے رہتے ہیں ٹی وی ٹاک شوز میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ سیاستدان اور میڈیا ملک میں بحرانوں اور مسائل کی وجہ چند شخصیات کو قرار دیتا ہے۔سسٹم کی خوبیوں یا خامیوں پر بحث نہیں کرتے۔ان کے نزدیک اگر چند لوگوں کو اقتدار سے ہٹا کر چند دوسرے لوگوں کو اقتدار میں لایا جائے تو ہمارے مسائل حل ہو جائیں گے۔ یہ موضوعی سیاست ہے۔

اگر کوئی شخص ہماری کسی بات سے متفق نہیں ہے تو ہم ہمیشہ اسے غلط سمجھتے ہیں یہ بھی موضوعی سوچ ہے۔ عام لوگوں سے بحث کے دوران آپ کی کوشش ہوتی ہے کہ لوگ معاملات کو آپ کی نظر سے دیکھیں اور وہی نتیجہ اخذ کریں جو آپ نے کر رکھا ہے۔ جب ہم کسی سے کوئی سوال کرتے ہیں تو یہ بات ہمارے ذہن میں ہوتی ہے کہ اگر اس نے ہماری مرضی کا جواب دیا تو یہ شخص بہت علم والا ہے اگر اس نے ہماری مرضی کا جواب نہیں دیا تو یہ جاہل مطلق ہے۔

ہمارے ملک میں تو تاریخ کا علم بھی موضوعی بنا دیا گیا ہے۔ اسلامی تاریخ کے واقعات ہوں یا مسلمان حملہ آوروں کی تاریخ۔ ہم اس پر کوئی سوال نہیں اٹھاتے۔ یہاں تک کہ ہم نے اپنی نصابی کتب میں1965ء کی جنگ کو ایک جیتی ہوئی جنگ قرار دے دیا ہے جسے دنیا بھر کے مورخین نے ہاری ہوئی جنگ لکھا ہے۔ 9/11 کے واقعہ کو ہم ایک زاویئے سے دیکھتے ہیں جبکہ امریکی اسے دوسرے زاویئے سے دیکھتے ہیں۔ 16 دسمبر کا دن جس دن پاکستان آدھا رہ گیا تھا اور دوسرا آدھا بنگلہ دیش بن گیا تھا ہم نے اسے تاریخ کے اوراق سے نکال باہر کیا ہے تاکہ چند مخصوص لوگوں کی حکمرانی کو بچایا جا سکے۔

اخباروں کے کالم نگار اپنے تجزیئے زیادہ تر اپنی موضوعی سوچ کے تابع لکھتے ہیں ایک ہی واقعے کو مختلف تجزیہ نگار الگ الگ نقطۂ نظر سے دیکھ کر الگ الگ نتائج اخذ کرتے ہیں۔خوف کے اثر میں فیصلہ کرنا بھی موضوعی ہوتا ہے۔ مثلاً آپ نے جن بھوتوں کے متعلق کہانیاں سنی ہوتی ہیں۔ان کہانیوں کی وجہ سے آپ کے ذہن کے کسی گوشے میں خوف پوشیدہ

Sanjh Lok Raj

ہوتا ہے۔ اندھیرے اور تنہائی میں آپ اپنی طرف سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے اور یہ سوچ کر خود ہی ڈر بھی جاتے ہیں۔

سب سے زیادہ موضوعی فیصلے مفادات کے تابع کیے جاتے ہیں۔ فرض کریں کہ حکومت یہ اعلان کرتی ہے کہ ملک میں کوئی خاندان بے گھر نہیں ہوگا اور اس پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے حکومت ان لوگوں سے گھر سرکاری ملکیت میں لے لے گی جن کے پاس ایک سے زیادہ گھر ہیں اور ان لوگوں میں تقسیم کر دے گی جن کے پاس گھر نہیں ہیں۔ یہ خبر بے گھروں اور ایک سے زیادہ گھر رکھنے والوں پر الگ الگ طرح کا اثر کرے گی۔ یہاں تک کہ دونوں طرح کے لوگوں کے حق میں فتوے بھی آ جائیں گے۔ اسی طرح آپ اگر مولانا مودودی کی کتاب ''معاشیات اسلام'' پڑھیں گے تو آپ کو ایسا لگے گا کہ اسلام پرائیویٹ پراپرٹی کا محافظ اور سرمایہ داری کا حامی ہے۔ اگر آپ علامہ پرویز کی کتاب ''نظام ربوبیت'' پڑھیں گے تو آپ کو ایسا لگے گا جیسے اسلام تو پرائیویٹ پراپرٹی کا مخالف اور سوشلزم کا حامی ہے۔ حالانکہ ان دونوں کتابوں کے پڑھنے کے بعد آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نظریئے اور مذہبی خیالات بھی اپنے اپنے طبقے کے مفادات کے تابع قائم کیے جاتے ہیں۔

آپ نے سنا ہوگا کہ عشق و محبت، عقیدت، ہمدردی، تعصب و نفرت کے جذبات ہوں یا خوف، تکبر، بدگمانی اور برتری جیسے احساسات یا کوئی بھی مفاد پیش نظر ہو ان سب کی موجودگی میں عقل کام نہیں کرتی اس لیے ہم ایسے خیالات سے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ ان کا تعلق دل سے ہے۔ فلاں بات کو میرا دل نہیں مانتا وغیرہ۔ عقل اس بات کو مانتی ہے مگر دل تسلیم نہیں کرتا۔ دل کی باتوں کو اگر ہم کسی علمی اصطلاح میں تبدیل کرنا چاہیں تو انہیں موضوعی خیالات کہیں گے۔

موضوعی خیالات ایسے تصورات ہیں جو جذبات، تعصّبات اور مفادات کے تابع قائم کیے جاتے ہیں انہیں انگریزی میں(Subjective) کہتے ہیں۔ موضوعی سوچ ایک فرد کا وہم و گمان بھی ہوسکتا ہے اور اجتماع کا بھی۔ یہ ایسی سوچ ہوتی ہے جسے آپ نے کسی بیرونی تصدیق کے بغیر اپنے دل کی شہادت پر سچ تسلیم کرلیا ہوتا ہے۔

موضوعی تصورات چونکہ جذبات کے تابع قائم کیے جاتے ہیں اس لیے اگر کوئی ان

Sanjh Lok Raj

خیالات سے متفق نہ ہو تو آپ کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں۔ جذبات بھڑکانے والے کو آپ اپنا ذاتی دشمن خیال کرنے لگتے ہیں۔ جیسے فرقہ وارانہ فسادات جذباتی عمل کا نتیجہ ہیں اس لیے جب بھی کسی خیال سے آپ کے جذبات بھڑک اٹھیں تو آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ آپ کی موضوعی سوچ ہے۔

موضوعی سوچ جمودی ہوتی ہے کیونکہ موضوعی خیالات رکھنے والا شخص کتابوں میں اور دوسروں کی گفتگو میں ہمیشہ صرف اپنے خیالات کی تائید تلاش کرتا رہتا ہے۔ موضوعی سوچ اس وقت نقصان دہ ہوتی ہے جب آپ اپنے ذاتی وہم وگمان کے تابع زمانے بھر کے جدید علم اور ثابت شدہ سائنسی حقائق کو جھٹلاتے ہیں۔

موضوعی سوچ رکھنے والا شخص اپنی بات کو دنیا کی آخری سچائی اور قطعی علم سمجھنے لگتا ہے جس سے معاشرہ جامد ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح جیسے بے ہنگم ٹریفک میں گاڑیاں ایک دوسرے کا راستہ روک کر آمدورفت کا پورا نظام معطل کر دیتی ہیں۔

انسانی تاریخ پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ معاشروں نے موضوعی سوچ کا پیدا کردہ جمود توڑا تو ترقی کا سفر شروع ہوا۔ یہ جمود ایک فکری عمل کے ذریعے توڑا گیا۔ اس فکری عمل کو معروضی سوچ کہتے ہیں۔ یہ موضوع کے اُلٹ عمل ہے۔

معروض کا لفظ عرض سے نکلا ہے عرض کا مطلب ہے چوڑائی جیسے طول وعرض۔ اس کا دوسرا مطلب ہے کسی چیز کا ظاہر ہونا۔ کسی چیز کا خارج میں موجود ہونا۔ کسی چیز کا ذہن کے باہر اپنا آزاد وجود رکھنا۔ انگریزی میں اسے (Objective) سوچ کہتے ہیں۔

جہاں موضوعی سوچ نے مابعدالطبیعات کو جنم دیا ہے وہاں معروضی سوچ انسان کو سائنس کی طرف لے گئی۔ انگریزی زبان میں (Object) کا مطلب ہے چیز یا شے۔ چیزوں کو ہم دو طرح سے جانتے ہیں۔ ایک وہ جن کا مادی وجود نہیں ہے۔ اس لیے وہ ہمارے ذہن کے اندر موجود ہوتی ہیں جیسے ارادہ۔ حسرت اور لالچ وغیرہ۔ دوسری چیزیں وہ ہیں جو مادی وجود رکھتی ہیں۔ اپنی آزاد حیثیت میں ہمارے خارج میں موجود ہوتی ہیں اور وہ اپنے وجود کے لیے ہمارے ذہن کی محتاج نہیں جیسے میز۔ گلاس اور قلم وغیرہ ان معنوں کی نسبت سے معروضی سوچ ہر وہ خیال ہے جو آپ نے اپنی طرف سے نہ بنایا ہو بلکہ خارجی حقائق سے حاصل کیا

Sanjh Lok Raj

ہو۔ جو مکمل طور پر جذبات، تعصّبات اور مفادات سے آزاد ہو۔ یعنی ایسا خیال جس کا تصور دل سے نہ ہو بلکہ عقل سے ہو۔ عقل کا مطلب ہے آپ نے یہ خیال 5 حواس کے ذریعے خارجی وجود رکھنے والی چیزوں سے حاصل کیا ہو۔

میز پر ایک گلاس پڑا ہے۔ اس میز کے گرد 8 لوگ بیٹھے ہیں۔ اگر آپ ان لوگوں سے پوچھیں کہ میز پر کیا ہے تو سب کا ایک ہی جواب ہوگا کہ یہ گلاس ہے۔ یہ خیال معروضی ہے۔ اب ان 8 لوگوں میں سے ایک شخص کہتا ہے کہ اس گلاس میں پانی پینے سے ڈینگی کے بخار کو آرام آ جاتا ہے۔ اس کے ایسا ماننے کی وجہ وہ مقدس ہستی ہے جس کے بارے میں اس کا عقیدہ ہے کہ اس ہستی کو کائنات کا ہر راز معلوم ہے۔ اس ہستی نے اسے بتایا ہے کہ اس گلاس میں پانی پینے سے ڈینگی کا مریض شفایاب ہو جاتا ہے۔ وہ باقی لوگوں کو بھی گلاس کی اس کرشماتی خصوصیت کو ماننے پر قائل کرنا چاہتا ہے۔ تین اور لوگ اس کے حامی ہو جاتے ہیں۔ ان کا یہ خیال موضوعی ہے۔ باقی چار لوگ جو گلاس کی کرشماتی خصوصیت کو کسی ایک کے کہنے کی وجہ سے نہیں مانتے بلکہ وہ ڈینگی کے مریضوں کو لے آتے ہیں ان سب کو اس گلاس میں پانی پلایا جاتا ہے جس کے نتیجے میں سب لوگوں کو شفا ہو جاتی ہے تو یہ چار لوگ بھی گلاس کی کرشماتی خصوصیت پر یقین کر لیتے ہیں ان کا یہ ماننا اب بیرونی عوامل اور مشاہدے سے اخذ کیا گیا ہے۔ اس لیے ان کا یہ خیال کہ (گلاس میں پانی پینے سے ڈینگی کا مریض شفایاب ہو جاتا ہے) معروضی ہے۔

ایک صورت یہ بھی کوئی ہے کہ اس گلاس میں پانی پینے سے ڈینگی کے کسی بھی مریض کو آرام نہ آئے پھر بھی ان میں سے کوئی شخص اس بات پر قائم رہے کہ گلاس میں پانی پینے سے ڈینگی کے مریض کو آرام آ جاتا ہے تو ایسا یقین محض وہم و گمان ہے، عقیدہ بھی موضوعی ہوتا ہے۔

سوچنے کے موضوعی اور معروضی ڈھنگ کی نوعیت بھی طبقاتی ہے۔ بے انصافی، ظلم اور جبر پر مبنی نظام فرضی کہانیوں پر یقین کروانے کے موضوعی خیالات کے بل بوتے پر قائم رکھے جاتے ہیں۔ یہ حکمران طبقے کا ہتھیار ہے۔ جبکہ معروضی سوچ ہر انسان کو اس قابل بناتی ہے کہ وہ حقیقت تک خود رسائی حاصل کرے اور جبر اور خوف سے چھٹکارا حاصل کرے۔

Sanjh Lok Raj

جاننے کا سائنسی طریقہ

سالہا سال کے زندگی کے تجربے سے ابتدائی انسانوں کو پتہ چل گیا تھا کہ سردیوں کے بعد بہار آتی ہے پھر گرمیاں۔ گرمیوں کے بعد خزاں اور پھر سردیاں لوٹ آتی ہیں۔ ایسا اس کے معروض میں باقاعدگی سے ہو رہا تھا۔ موسموں کی تبدیلی انسان کی وہ پہلی دریافت تھی جو ہمارے آباء و اجداد نے معروض میں ہونے والی تبدیلیوں کے مشاہدے سے کی۔ انہیں یقین ہو گیا کہ موسموں کی تبدیلی عارضی نہیں بلکہ مستقل ہے اور باقاعدہ۔ اس طرح سال بھر کی موسمی تبدیلیوں کے حوالے سے اس نے فصلیں کاشت کرنے کی ترتیب بنائی۔ مصریوں نے دریائے نیل کے سیلاب کے مشاہدات کر کے یہ دریافت کر لیا کہ سیلاب اتفاقیہ نہیں کہ جب دل چاہے آ جائے بلکہ خاص موسم میں آتا ہے۔ اس طرح انہوں نے ایک سیلاب سے دوسرے سیلاب کے درمیانی عرصے کو ایک سال شمار کیا۔ اپنے معروض میں ہونے والے واقعات کا مشاہدہ کرنا۔ حساب لگانا اور نتائج اخذ کرنا اب کچھ لوگوں نے سیکھ لیا تھا۔

دریائے دجلہ وفرات کے کنارے آباد بابلی تہذیب، راوی اور سندھ کے کنارے آباد ہڑپہ اور موئین جوڈرو کی تہذیب، چین میں دریائے زرد کے کنارے آباد چینی تہذیب کے لوگوں نے پندرہ ہزار برس قبل پیداوار کے طریقوں کے ارتقا کے ذریعے غیر یقینی حالت کو ایک حد تک یقینی حالت میں بدل لیا تھا وہ اس طرح کہ انہوں نے بارشوں کے موسم کے ہونے کا ٹھیک ٹھیک پتہ چلا لیا تھا۔ پھر بھی جب بارش نہیں ہوتی تھی تو وہ بارش کے پانی کی کمی دریاؤں سے پانی لا کر پوری کر لیتے تھے۔ اس طرح لوگوں میں خود پر اعتماد بڑھنے لگا تھا۔

ابتدائی لوگوں کی زندگی میں کئی بار ایسے واقعات رونما ہوئے جس سے انہیں لگتا تھا کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ وبائی بیماریاں پھیلتی تو پورے پورے شہر اور گاؤں خالی کر دیتیں۔

Sanjh LokRaj

جب کبھی گہرے سیاہ بادلوں کے کئی روز تک آسمان پر چھائے رہنے سے دھرتی پر مسلسل اندھیرا رہتا تو لوگ کہتے تھے کہ سورج ٹھنڈا ہو گیا ہے اور وہ اب کبھی نہیں نکلے گا۔ اس طرح کے کئی اور واقعات سے لوگوں کو لگتا کہ دنیا کا خاتمہ قریب ہے۔ لیکن اس کے باوجود انسان دنیا کے خاتمے کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھا نہیں رہا۔ وہ ایک مسلسل جنگ لڑ رہا تھا۔ دریاؤں سے لڑتے لڑتے انسان اپنے گھروں کو اونچے ٹیلوں پر لے گیا تھا۔ جنگلوں سے لڑتے ہوئے اس نے زمین کے بہت بڑے بڑے ٹکڑے صاف کر کے کاشت کرنے شروع کر دیئے تھے۔ صاف کیے گئے جنگلوں کی لکڑی سے انسان آگ جلانا اور کشتی بنانا سیکھ گیا تھا۔ اپنی دنیا بناتے بناتے انسان نے قدرت سے مقابلے میں جیت حاصل کرنی شروع کر دی تھی۔

آدمی کا سب سے بڑا دشمن تیز دانتوں والا چیتا یکدم لمبے بالوں والا اونی کوٹ نہیں پیدا کر سکا۔ آدمی نے ایسا کر لیا۔ اس کے لیے اسے صرف ریچھ کو مار کر اس کی کھال نکالنی پڑی، تیز دانت والا چیتا آگ نہیں بنا سکتا تھا لیکن آدمی ایسا کر سکتا تھا۔ اس طرح انسان دوسرے جانداروں سے مقابلہ جیت کر آگے بہت آگے نکل گیا تھا۔ اس طرح دنیا ختم تو نہیں ہوئی بلکہ تبدیل ہونے لگی۔ انسانوں کی تعداد میں بھی ہر سال اضافہ ہو رہا تھا۔ جو لوگ اپنے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں کا مشاہدہ کر کے نتائج اخذ کر رہے تھے اور اپنے حواس پر یقین کر کے دنیا کو جان رہے تھے ان لوگوں نے وہم اور علم کے درمیان فرق کیا اور وہم سے پیدا ہونے والے خوف کو علم سے پیدا ہونے والے اعتماد کے ذریعے قابو کیا۔

جن لوگوں کو قیاس کی بجائے اپنے حواس پر یقین تھا وہ اپنے اردگرد کی دنیا ہی کو حقیقی دنیا سمجھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ وہی حقیقت ہے جسے آپ حواس کے ذریعے جان سکیں ورنہ قیاس تو ہر ایک شخص کا دوسرے سے الگ ہوتا ہے۔ وہ پہلے سے اپنے ذہن میں کوئی تصور رکھ کر نہیں سوچتے تھے بلکہ ہر قسم کے قیاسی تصورات و روایت کو اپنے ذہن سے صاف کر کے اس چیز پر غور کرتے تھے جو ان کے معروض میں حقیقی وجود رکھتی ہے۔ کائنات، مظاہر فطرت اور خود انسان کے بارے میں عقلی انداز سے غور و فکر کرتے تھے اور جن نتائج تک پہنچتے ان کو بغیر کسی ماورائی حوالہ کے اپنی فکر کے نتیجے کے طور پر پیش کرتے۔ اس طرح جو علم وجود میں آیا وہ فلسفہ کہلاتا ہے۔

Sanjh Lok Raj

فلسفہ بھی ماں کے پیٹ میں ایک بچے کی طرح اپنے خدوخال واضح کرنے سے پہلے بے ڈھنگ کی اور خام شکلوں میں موجود رہا ہے۔لیکن ایک بات جو فلسفہ کے ارتقاء میں بنیادی کردار ادا کرتی رہی وہ یہ یقین تھا کہ حواس ہی بیرونی دنیا کے ساتھ ہمارا تعلق قائم کرتے ہیں اور حسی تجربہ ہی علم کا واحد ذریعہ ہے۔

ہیروڈوٹس کہتا ہے کہ طالیس جسے فلسفے کا بانی تصور کیا جاتا ہے فنقی الاصل ہڑپن تھا ہڑپہ کے لوگ آریاؤں کے حملوں کے بعد ایشیائے کوچک پھر ایرانیوں کی تاخت وتارج کے بعد یونان کے شہروں میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور اپنے ساتھ فلسفے اور سائنس کے اصولوں کو بھی لے گئے تھے۔ طالیس سے پوچھا گیا کہ کیا کائنات بعل مردوخ اور آئن رع نامی دیوتاؤں نے بنائی ہے تو اس نے کہا کہ نہیں۔کائنات پانی سے بنی ہے۔ ہریقلیطس نے کہا کہ کائنات آگ سے بنی ہے اسے کسی دیوتا یا انسان نے نہیں بنایا یہ ہمیشہ سے ہے اور ابدی آتش کی طرح ہمیشہ رہے گی۔ ایمپے ڈکلیس نے چار عناصر کا نظریہ پیش کیا کہ کائنات پانی،مٹی، آگ، ہوا سے مل کر بنی ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی قابل فنا نہیں۔

ڈیموکرائٹس وہ شخص تھا جس نے اپنے سے پہلے فلفسیوں کے خیالات کو مرتب کر کے ایک باقاعدہ نظام فکر کی بنیاد رکھی۔ پہیلی نما اور گول مول خیالات کو واضح شکل دی۔اس نے کہا۔

1۔ یہ کائنات مادے سے بنی ہے اور مادہ ایٹموں کی شکل میں موجود ہے۔
2۔ مادہ ازلی اور غیر فانی ہے۔
3۔ مادے میں اندرونی طور پر تبدیلیوں کی صلاحیت موجود ہے۔
4۔ مادے میں حرکت اور تبدیلیاں قوانین کے تابع رونما ہوتی ہیں۔
5۔ شعور اور ذہن بھی دوسری مادی اشیاء کی طرح ایٹموں سے مرکب ہیں۔
6۔ فطرت میں کوئی واردات بغیر سبب کے نہیں ہوتی۔

ہزاروں سال فلسفہ صرف تصورات کے فاضلانہ مطالعہ کا نام تھا۔ جرمن فلسفی ایوکن کے مطابق رابرٹ بائل نے 1674ء میں ایسے خیالات کے لیے فلسفہ مادیت کی اصطلاح وضع کی۔فلسفہ مادیت کا انداز نظر اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود فلسفہ کا۔

تاریخ فلسفہ میں عقلی اندازوں اور حسیات کا مقابلہ شروع ہی سے رہا ہے۔ لیکن

Sanjh Lok Raj

سلطنت رومہ کے زوال کے بعد یورپی تاریخ کروٹ لے رہی تھی۔ دورِ شعور(Age of reason) کا آغاز ہو چکا تھا تاریک صدیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ بنیادی سوال پر بحث مباحثہ ہو رہا تھا کہ وہ دنیا جس کا ادراک ہم حواس سے کرتے ہیں وہ حقیقی ہے یا وہ دنیا جسے ہمارا ذہن تخلیق کرتا ہے یعنی باطنی دنیا؟ اس طرح کائنات کی حقیقت کے متعلق دو نظریئے وجود میں آئے ایک وہ جو افلاطون کی روایت سے یادگار ہے جس کی رو سے امثال حقیقی ہیں دوسرا وہ جس کی رو سے وہ اشیاء حقیقی ہیں جو ہمارے تجربے اور مشاہدے میں آتی ہیں۔ یعنی امثال حقیقی ہیں یا مادہ؟ روح حقیقی ہے یا جسم؟ خیال حقیقی ہے یا مادہ؟ یہ وہ بحث تھی جس نے فکری دنیا کو دو واضح حصّوں میں تقسیم کر دیا۔ امثال کو حقیقی ماننے والوں نے مذاہب کو قوت بخشی اور مادے کو حقیقی ماننے والوں نے سائنس کی بنیادیں استوار کیں۔ اس طرح فلسفہ مادیت نے سائنس کو جنم دیا۔

امثال کو حقیقی سمجھنے والے اشیاء میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ ان کے نزدیک روح ہی دراصل انسانی شعور بھی ہے۔ روح عالم امثال یا باطنی دنیا سے آتی ہے اس لیے شعور کا تعلق بھی باطنی دنیا سے ہے۔ علم باطنی دنیا سے مراقبہ، توجہ اور آنکھیں بند کر کے اپنی روح کے اندر جھانکنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے اشیاء کی طرف دھیان دینے سے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔

مثالیت پسندوں کے نزدیک کائنات ایک مکمل وجود ہے اس میں تبدیلی یا ارتقا کی کوئی گنجائش نہیں مکمل وجود کا مطلب ہے جیسے ایک میز آپ کے سامنے پڑی ہے ایک بار بن کر مکمل ہو گئی بس اور اس کے بارے میں علم صرف اتنا ہی ہے کہ یہ میز ہے۔ جس طرح میز کے بارے میں یہ علم ہونا کہ یہ میز ہے ایک مکمل علم ہے اسی طرح کائنات کے بارے میں یہ علم ہونا کہ یہ کائنات ہے ایک مکمل علم ہے۔ اس سے زیادہ سوچنے سے ذہنی پیچیدگیوں کے سوا آپ کے ہاتھ کچھ نہیں آئے گا۔

افلاطون کے مطابق علم روح کی یادداشت کو واپس لانے کا نام ہے۔ مثالیت پسندوں کے نزدیک ہر انسان میں یہ صلاحیت موجود نہیں کہ وہ باطنی دنیا کو جان سکے اور باطنی دنیا یا عالم امثال کا علم حاصل کر سکے۔ افلاطون کے مطابق صرف فلسفی ہی یہ کام کر سکتا ہے مذاہب کی تعلیم کے مطابق کوئی صاحب کمال ہی باطنی دنیا تک رسائی کے ذریعے ظاہری دنیا کا علم حاصل کر سکتا ہے۔ اس لیے صاحب کمال باطنی دنیا میں توجہ کر کے ظاہری دنیا کے متعلق جو

Sanjh Lok Raj

معلومات دے وہ بلا چون و چرا تسلیم کرو۔

سوال یہ ہے کہ ہمیں کیسے پتہ چلے کہ روح کی یادداشت واپس آ گئی ہے؟ اور ایسے علم کی صحت کی ضمانت کہاں سے مل سکتی ہے۔ مثالیت پسندوں نے اس کی تصدیق کا جو طریقہ بیان کیا ہے اسے (Rationalism) کہتے ہیں۔

مثالیت پسندوں کے نزدیک عقلی استدلال ہی سچائی تک پہنچنے کا واحد ذریعہ ہے۔ اگر دو شخص اس بات پر بحث کر رہے ہوں کہ ’’آب حیات پینے والے انسان کو کبھی موت نہیں آتی‘‘ تو ان کے لیے ضروری نہیں ہے کہ انہوں نے آب حیات کبھی دیکھا بھی ہو۔ بس وہ اپنے دلائل ہی سے اس بات کو پایہ ثبوت تک پہنچا سکتے ہیں کہ آب حیات پینے والے کو موت نہیں آتی۔ اس طرح مثالیت پسندوں کا اپنے علم کی تصدیق کا ذریعہ محض قیاسات، عقلی اندازے اور موضوعی دلیلیں ہیں یہ ہے علم تک پہنچنے کا مابعدالطبیعاتی طریقہ۔ ایسا علم جو محض عقلی دلائل سے حاصل کیا جاتا ہے اس کی مثالیں اس طرح ہیں جس سے ہمیں (Rationalism) کی سمجھ آئے گی۔

ایک زمانہ تھا جب زمین کو کائنات کا مرکز سمجھا جاتا تھا۔ مرکز سمجھے جانے کی وجہ سے زمین ساکن بھی سمجھی جاتی تھی۔ اور دیگر سیارے اس کے گرد حرکت کرتے سمجھے جاتے تھے۔ ان سیاروں کی حرکت زمین پر اس طرح اثر انداز ہوتی تھی کہ جس سے موسم کی تبدیلیاں رونما ہوتی تھیں۔ یہ اپنے زمانے کا سچ تھا۔ اس سچ کی بنیاد پر یہ سوال اٹھا کہ اگر سیاروں کی گردش زمین پر اتنا اثر ڈالتی ہے کہ سردیوں کو بہار اور پھر گرمیوں میں تبدیل کر دیتی ہے تو سیاروں کی گردش انسانوں کی زندگی اور حالات پر اثر کیوں نہیں ڈال سکتی؟ اس طرح اس دلیل پر علم فلکیات (Astrology) کا علم وجود میں آیا۔ اب یہ ثابت ہو گیا ہے کہ موسموں کی تبدیلی زمین کے اپنے ہی محور کے گرد گھومنے سے ہوتی ہے مگر علم فلکیات آج بھی قائم ہے۔

ایمپیے ڈکلیس نے نظریہ پیش کیا تھا کہ کائنات چار عناصر سے مل کر بنی ہے۔ پانی، مٹی، آگ، ہوا اس کے مطابق انسان کی ساخت بھی کائنات کی ساخت سے مشابہ ہے۔ جس طرح کائنات کے اجزاء پانی، مٹی، آگ اور ہوا ہیں۔ اس طرح انسانوں میں بھی چار خلطیں ہیں۔ صفرا، بلغم، خون اور سودا۔ انسانی جسم میں کسی ایک کے زیادہ ہونے سے انسان کو بیماریاں

Sanjh Lok Raj

لگتی ہیں۔ اس نظریئے کے مطابق علاج کا مقصد جسم میں ان عناصر کا باہمی توازن بحال کرنا ہے۔لیکن اب تو 90 عناصر اور کروڑوں کیمیائی مرکبات دریافت ہو چکے ہیں۔

تعلیم کے مابعدالطبیعاتی نظریہ کی طویل بحث کا مقصد یہ ہے کہ اس نظریہ کے تمام پہلو آپ کی نظروں کے سامنے ہوں تا کہ اس کی مخالفت میں ابھرنے والے سائنسی نظریہ تعلیم کے تمام پہلوؤں پر ترتیب سے بحث کی جائے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھ لیا کہ مابعدالطبیعاتی نظریہ تعلیم کی بنیاد عقلیت(Rationalism) ہے اسی طرح سائنسی نظریہ تعلیم کی بنیاد تجربیت (Empiricism) ہے۔ دنیا کو جاننے کے سائنسی طریقہ کو انسانی فکر کی تاریخ کے سفر میں ہم تین مراحل سے گزرتا ہوا دیکھتے ہیں۔

پہلا مرحلہ ہے فلسفہ مادیت کا۔ مادے کو حقیقی سمجھنے والے اشیاء میں دلچسپی لیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مادے میں جو ظاہری یا داخلی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں ان کی وجوہات کو مادے کے اندر ہی تلاش کرنا چاہیے۔مظاہر فطرت کو بھی مادے کی خصوصیات کے طور پر دیکھنا چاہیے۔

فلسفہ مادیت کی بنیاد اگر چہ فلسفیوں نے رکھی مگر اسے سمجھنے کے لیے آپ کا فلسفی ہونا ضروری نہیں کیونکہ یہ بہت عام اور سادہ سے حقائق ہیں جنہیں انسان نے اپنے مشاہدے سے اخذ کیا ہے۔ صدیوں کی سوچ بچار کے بعد یہ لوگ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کائنات جس چیز سے بنی ہے اسے مادہ کہتے ہیں مادہ چھوٹے چھوٹے ذرات سے مل کر بنا ہے۔ ہر ذرہ اپنے اندر مزید چھوٹے ذرات کا ایک پورا سسٹم رکھتا ہے مادہ نہ تو پیدا کیا جا سکتا ہے نہ ہی فنا کیا جا سکتا ہے۔ مادہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ مادہ ایک حالت سے دوسری حالت میں تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ اسی طرح مادہ اور توانائی ایک دوسرے میں تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ اسے قانون بقائے مادہ کہتے ہیں۔ مادے کی ظاہری حرکت اور مادے کی ساختیاتی تبدیلیاں مادے میں موجود اندرونی خصوصایت پر منحصر ہیں۔ مادے کی اندرونی خصوصیات کو دریافت کرنے سے ہمیں قوانین فطرت کا پتہ چلتا ہے۔ یہ قوانین کسی بیرونی طاقت نے نہیں بنائے اور کوئی بیرونی طاقت ان قوانین کو بدل بھی نہیں سکتی کیونکہ یہ مادے کی فطرت ہیں۔ اشیاء اور مادے کو حقیقی ماننے والے اپنا سارا زور اشیاء کی ماہیت وحقیقت کو سمجھنے میں صرف کرتے رہے بالآخر ان کے سامنے یہ سوال آیا کہ مادی چیزوں کے علم حاصل کرنے کا طریقہ کیا ہے؟

Sanjh Lok Raj

دوسرے مرحلے پر تجربیت کا دور آیا۔ یہ بھی کسی حد تک فکری تھا۔ گلیلیو اور بیکن اس نئے فکری رجحان کے اوّلین ترجمان سمجھے جاتے ہیں۔ بیکن نے یہ کہہ کر علم کا ماخذ حسیات ہیں اور علم صرف انسانی تجربے سے حاصل کیا جا سکتا ہے تجربیت کی بنیاد رکھی۔ وہ کہتا ہے کہ اس دنیا کی ہر شے حقیقی ہے اور ان پر کبھی نہ تبدیل ہونے والے قوانین کا راج ہے ان قوانین کی تجربے کے ذریعے دریافت سے ہم کائنات کے رازوں کے مالک بن جاتے ہیں۔ جان لاک نے بیکن سے اتفاق کرتے ہوئے اس سوچ کو آگے بڑھایا۔ اس نے کہا کہ پانچ حواس ہمارے علم کا ماخذ ہیں۔ جامد ازلی صداقتوں کا کوئی وجود نہیں جوں جوں انسان کی علمی سطح بلند ہوتی جائے گی نئے نئے حقائق اور صداقتیں انسان پر کھلتی جائیں گی۔ اس نے کہا کہ انسانی ذہن ایک کورے کاغذ کی مانند ہے جس پر زندگی کے واقعات، تجربے اور مشاہدے سے تاثرات مرتب ہوتے ہیں۔ انہی تاثرات کو منظّم کرنا اور ایک باقاعدہ شکل دینا ذہن کا کام ہے۔ انہی تاثرات پر ہمارا تمام علم منحصر ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے والی ہے کہ تجربیت کے مطابق ہر انسان جس کے حواس کام کرتے ہیں وہ علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے بشرطیکہ اسے علم حاصل کرنے میں دلچسپی ہو۔ آپ نے دیکھا تھا کہ عقلیت(Ratonalism) کے طریقہ سے آپ کسی کو بھی صرف عقلی دلائل سے سمجھا سکتے ہیں کہ نیلا رنگ کیا ہوتا ہے۔ مگر تجربیت(Empericism) کے طریقہ میں آپ کو نیلا رنگ سمجھنے کے لیے اسے دیکھنا پڑے گا۔

تیسرا مرحلہ ہے تصدیق۔ ہمارے پاس کیا ثبوت ہے کہ حسی تجربے سے حاصل ہونے والا علم ہی درست علم ہے؟ اگر تجربہ ہی علم کا واحد ماخذ ہے تو اس علم کی صحت کی ضمانت کہاں مل سکتی ہے جو تجربے سے حاصل ہوا ہے؟

تجربے سے حاصل ہونے والے علم کی تجربی تصدیق ہی اس کے غلط یا صحیح ہونے کا پیمانہ ہے۔ سائنسی نظریہ تعلیم کا یہ مرحلہ فکری نہیں بلکہ تجربی تھا۔ تیسرے مرحلے پر آ کر فلسفہ مادیت ایک نئے علم میں تبدیل ہو گیا ہے جسے سائنس کہتے ہیں۔ ابتداء میں سائنس کو (Natural Philosophy) کہا جاتا تھا۔ تجربی تصدیق کو ہم روزمرہ زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے والی مثال سے سمجھتے ہیں بائیولوجیکل سائنس دانوں نے دریافت کیا کہ پرندوں میں الگ الگ قسم کے جینز ہوتے ہیں کچھ جینز گوشت پیدا کرتے ہیں اور کچھ دوسرے انڈے پیدا کرتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

اس طرح جینز کی دریافت ایک علم تھا۔ جو سائنسدانوں نے تجربات اور مشاہدے سے حاصل کیا۔ مگر ابھی اس کی تصدیق ہونا باقی تھی۔ لیکن جب بائیولوجسٹوں نے جینز کو پہچان کر الگ الگ کیا اور کچھ مرغیوں میں گوشت پیدا کرنے والے جینز داخل کیے۔ جس سے ایک ایسی نسل تیار ہوئی جسے برائلر کہتے ہیں کم وقت میں زیادہ گوشت کا پیدا ہونا اس بات کی تصدیق تھی کہ واقعی گوشت پیدا کرنے والے جینز ہوتے ہیں۔ اس طرح آپ نے دیکھا ہوگا کہ دوسری قسم کے جینز سے انڈے پیدا کرنے والی مرغی کی نسل تیار کی گئی۔ یہ تجربی تصدیق تھی۔ اس طرح ایک تو ہماری خوراک کی قلت کا مسئلہ حل ہو گیا دوسرے فطرت کے کاموں میں انسان کی دسترس بڑھی۔ اس طرح سائنسی نظریہ تعلیم یہ ہے کہ سچائی کا معیار تجربی تصدیق ہے۔

کرۂ ارض پر ایک عظیم ہستی ہے۔

اس کے ہاتھ ایسے ہیں کہ وہ آسانی سے انجن اٹھا لیتے ہیں۔

اس کے پر ایسے ہیں کہ وہ اس کو بادلوں کے اوپر وہاں لے جاتے ہیں جہاں پرندہ پر نہیں مار سکتا۔

اس کے پیر اک ایسے ہیں کہ وہ پانی کے نیچے کسی مچھلی سے زیادہ بہتر کام کرتے ہیں۔

اس کی آنکھیں ایسی ہیں کہ وہ غائب چیز کو دیکھ سکتی ہیں اور کان ایسے ہیں کہ دنیا کے دوسرے سرے کی بات سن سکتے ہیں۔

یہ ہستی اتنی طاقتور ہے کہ پہاڑوں کے اندر سرنگیں بناتی ہے اور آبشاروں کو ہوا میں معلق کر دیتی ہے وہ اپنی مرضی کے مطابق دنیا کے خدوخال بدل رہی ہے۔ جنگل لگا رہی ہے۔ سمندروں کو ایک دوسرے سے ملا رہی ہے۔ ریگستانوں کو سیراب کر رہی ہے۔

یہ عظیم ہستی کون ہے؟

انسان

لیکن وہ عظیم کیسے بنا؟ کرۂ ارض تو کیا کائنات کا مالک کیسے بنا؟

اب تک ہم نے جو داستان بیان کی ہے وہ انسان کی اپنی محنت سے حاصل کی گئی کامیابیوں کی داستان ہے جس سے انسان اب فطرت کا غلام نہیں رہا بلکہ اس کا مالک بنتا جا رہا ہے۔

Sanjh Lok Raj

سیکولر تعلیم

انسانی عقل۔ انسانی علم اور تجربے کو مسائل کے حل کا ذریعہ سمجھنا سیکولرازم ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اجتماعی انسانی مسائل حل کرنے کے لیے انسانی علم اور عقل کافی ہیں۔ سیکولرازم ہی کو سائنسی سوچ بھی کہتے ہیں۔

انسان سے متعلق سیکولر یا سائنسی سوچ یہ ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔کوئی چھوٹا یا بڑا نہیں ہے کوئی کسی سے کم تر یا کوئی کسی سے برتر نہیں ہے۔کوئی انسان اپنی ذاتی خوبیوں یا خامیوں کی وجہ سے اچھا یا برا ہے۔ اچھائی یا برائی کا معیار انسانیت اور معاشرتی بہبود ہے۔ ہر وہ کام برا ہے جو دوسرے انسانوں کے لیے نقصان دہ ہو وہ جس سے کسی انسان کی حق تلفی ہو۔ اس سوچ کے مطابق حقوق وفرائض کی بنیاد بھی کوئی ماورائی عقیدہ نہیں بلکہ اس کی بنیاد بھی عقلی اور افادی ہے۔ سیکولر یا سائنسی سوچ کے مطابق سب سے بڑا جرم انسانی محنت کا استحصال ہے۔ کیونکہ محنت کا استحصال دوسرے تمام استحصالوں کی بنیاد ہے۔ یہ گوارا نہیں کہ بہت سے لوگوں کی محنت چند لوگوں کے عیش وعشرت کا سامان بنتی رہے۔ مردوں اور عورتوں میں مکمل مساوات ہو۔ مردوں اور عورتوں کے حقوق برابر ہوں اور انہیں اپنی اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے مساوی مواقع میسر ہوں۔

معاشرے سے متعلق سیکولر یا سائنسی سوچ یہ ہے کہ معاشرہ مساوات اور عدل کے اصولوں پر قائم ہو۔ عدل کا مطلب مساوی ہونے کے حق کا تحفظ ہے نہ کہ صاحب جائیداد لوگوں کے مفادات کا تحفظ۔ انسانی معاشرہ ایسا ہو جس میں تمام افراد خوشحال ہوں۔ ہر فرد کی ضروریات احسن اور آسان طریقے سے پوری ہوں۔ ہر فرد کو روزگار، تعلیم کے مواقع یکساں میسر ہوں۔ ساری سہولتیں، ساری خوشیاں، سارے سکھ اور ساری مسرتیں تمام انسانوں میں

Sanjh Lok Raj

مساوی تقسیم ہوں۔ سائنس کی فتوحات سے انسانی تمدن کو خوبصورت اور خوشگوار بنایا جائے۔ جدید ٹیکنالوجی سے انسانوں کی زندگیوں کو زیادہ آرام دہ اور زیادہ پر آسائش بنایا جائے۔

مذہب کے بارے میں سیکولر اور سائنسی سوچ یہ ہے کہ مذہبی عقیدہ کسی فرد کا خالصتاً ذاتی معاملہ ہے اور صرف اس کی ذات تک محدود ہے۔ اپنے اس عقیدے کو نہ تو کسی پر مسلط کیا جا سکتا ہے نہ دوسرے افراد سے تعلقات کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ تمام مذاہب کا یکساں احترام ہو۔ دنیا کے کسی بھی مذہبی عقیدے کی تضحیک نہ کی جائے نہ کسی مذہب کے خلاف قانون سازی کی جائے۔ دنیا کے تمام مذاہب کے بارے میں بے تعصبی کا نام سیکولر یا سائنسی سوچ ہے۔

کبھی آنکھ میں ریت کا ذرہ پڑ جائے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ آنکھ فوری طور پر پانی چھوڑنے لگتی ہے اور ہمارے ہاتھ غیر ارادی طور پر آنکھ کی طرف لپکتے ہیں تا کہ آنکھ کو نقصان پہنچنے سے پہلے ہی بیرونی عنصر کو نکال باہر کریں۔ ہماری آنکھ کی بناوٹ ہی اتنی نازک ہے کہ وہ بیرونی عنصر کا بوجھ نہیں اٹھا سکتی۔ سائنسی سوچ کا لفظ بھی ہمارے معاشرے کی اکثریت کی نازک سوچ پر اسی طرح بھاری پڑتا ہے جیسے آنکھ میں ریت کا ذرہ۔ ریاستی نظام تعلیم، میڈیا اور رائے بنانے کے دیگر ذرائع سے ہماری سوچ کو مابعدالطبیعاتی بنایا جاتا ہے اس پر بھاری رقوم خرچ کی جاتی ہیں تا کہ ہمارے ذہن کی مابعدالطبیعاتی بناوٹ کی نزاکت سائنسی سوچ کے لفظ کو قبول نہ کرے۔

ویسے بھی ہمارے معاشرے میں سائنس کو الجبرے کے کلیئے، فزکس کے فارمولے، کیمیائی مساواتوں اور بائیالوجی کے ڈائیگرام رٹا کر حافظ سائنس بنانے تک محدود رکھا گیا ہے۔ سائنس ہمارے پیداواری عمل کے دوران پیدا نہیں ہوئی بلکہ ہمارے پیداواری عمل کو روک کر سرمایہ دار ملکوں کی مصنوعات کی کھپت کے لیے راہ ہموار کرنے کے لیے نافذ کی گئی ہے۔ آج تو خیر تعلیم میں مقابلے کا دور ہے، اور لوگ اپنے بچوں کو ان کی مرضی کے خلاف ڈاکٹر یا انجینئر بنانے کی کوشش میں زبردستی سائنس پڑھواتے ہیں۔ ہماری تعلیم کے زمانے میں تو سائنس پڑھنے والے طالب علم کو طرح طرح کی کہانیاں سنا کر اس کی حوصلہ شکنی کی جاتی تھی کہ فلاں شخص جس کو موٹے شیشے والی عینک لگی ہوئی ہے وہ سائنس پڑھنے کی وجہ سے ہے یا یہ کہ سائنس پڑھتے پڑھتے فلاں بچے کا دماغ چل گیا۔ کبھی کوئی کہہ دیتا تھا کہ سائنس پڑھنی ہے

Sanjh Lok Raj

تو بادام کھایا کرو وغیرہ۔

ہمارا معاشرہ چونکہ بنی بنائی چیزوں اور بنے بنائے نظریات کو استعمال کرنے کا عادی ہے اس لیے اگر ہمیں کوئی چیز خود بنانی پڑے یا کوئی نئی بات سوچنی پڑے تو یہ عمل ہمارے لیے ایسا ہے ہے جیسے بغیر سیڑھی کے چھت پر چڑھنا۔ سائنسی سوچ ایک رویہ ہے دنیا کو دیکھنے کا اور زندگی گزارنے کا ایک طریقہ ہے جس کے لیے فزکس اور بیالوجی کا پڑھا ہوا ہونا لازمی نہیں۔ مثال کے طور پر کسی ان پڑھ کو موٹر سائیکل خراب ہو جائے اور وہ اس خرابی کو انجن کا اندرونی نقص سمجھتے ہوئے مکینک کے پاس لے جائے تو اس کا یہ رویہ سائنسی ہے اور اگر کسی پڑھے لکھے انسان کا موٹر سائیکل خراب ہو جائے اوور وہ اس خرابی کو نظر بد کی پیدا کی ہوئی سمجھ کر موٹر سائیکل کو دم کروانے لے جائے تو اس کا رویہ غیر سائنسی ہے۔ ہمارے معاشرے کی سوچ کی تعمیر اس طرح کی گئی ہے کہ کچھ چیزوں کے بارے میں ہمارے رویئے اگرچہ سائنسی بھی ہو جائیں تب بھی ہم ان کی وجوہات کو مابعدالطبیعاتی سمجھیں۔ جیسے سیلاب اور زلزلوں کی وجہ ہمارے اعمال کا نتیجہ بتایا جاتا ہے تاکہ غربت اور بیروزگاری کی وجہ کو بھی ہم غلط معاشی نظام میں تلاش کرنے کی بجائے اپنی ہی کسی عمل پر محمول کریں۔ پاکستان میں تو خیر سائنس پڑھنے والوں کو مابعدالطبیعاتی بنانے پر زیادہ دھیان دیا جاتا ہے۔ اگر آپ نے پاکستان کی کسی یونیورسٹی یا کالج میں سائنس کا پیریڈ پڑھا ہو تو ہمیشہ یہ ہوتا ہے کہ یہ سب غلط ہے لیکن پڑھانا ہماری مجبوری ہے۔

میری عمر جب چالیس سال سے زیادہ ہو گئی تو مجھے اخبار اور کتاب پڑھنے میں مشکل پیش آنے لگی سر میں درد رہنے لگا۔ یہاں ل تک کہ میں پڑھنے لکھنے سے قاصر ہو گیا۔ ڈاکٹر سے رجوع کیا تو پتہ چلا کہ چالیس سال کی عمر کے بعد 80 فیصد لوگوں کی آنکھ کی پتلی یا تو سکڑ جاتی ہے یا پھیل جاتی ہے جس سے نزدیک یا دور کی نظر کمزور ہو جاتی ہے۔ سائنسی تحقیق کے مطابق آنکھ کی پتلی ایک عدسہ ہے۔ یہ عدسہ اگر سکڑ جائے تو اس میں واقع کمی کی پیمائش کر کے اس کمی کے مساوی پیمائش کا عدسہ عینک میں لگا دیا جاتا ہے جس سے آنکھوں کی بینائی ایسے ہو جاتی ہے جیسے اسے کبھی کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ قدرت نے 40 سال پورے ہونے پر میرے لیے لکھنا پڑھنا بند کر دیا تھا مگر عینک کی مدد سے آج اس واقعہ کو پندرہ سال گزرنے کے بعد بھی

Sanjh Lok Raj

میں بخوبی پڑھ لکھ رہا ہوں یہ مثال پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس کے ذریعے ہمیں زندگی سے متعلق دیگر مسائل سمجھنے میں مدد ملے۔ انسانی آنکھ کو ایک مسئلہ پیش آیا۔ انسانی عقل نے اس کی وجوہات کو آنکھ کے اندر ہی تلاش کیا۔ آنکھ کی خرابی سے متعلق انسانی عقل نے جو وجہ پہچانی وہ درست تھی یا غلط؟ اس کی تجربی تصدیق عینک سے ہوگئی اور پیمائش کی تصدیق عینک کے نمبر سے ہوگئی۔ وجوہات کی دریافت اور پیمائش (خواہ وہ خون کے ایک قطرے میں سرخ سیل کی تعداد ہی کیوں نہ ہو) نے انسانی عقل کی جاننے کی صلاحیت کی تصدیق کی ہے۔ جاننے کی صلاحیت ہی نے انسانی عقل کو حل دریافت کرنے کے قابل بنایا ہے۔

اسی طرح خاص کیمرے سے آپ یہ جان سکتے ہیں کہ ماں کے پیٹ میں بیٹی ہے یا بیٹا؟ برفانی ریچھ کے خون سے حاصل کئے گئے پروٹین کی مدد سے دل کے آپریشن کا دورانیہ بڑھانے میں مدد ملی ہے۔ میڈیکل ٹیکنالوجی اتنی ترقی یافتہ اور جدید ہوگئی ہے کہ انسانی جسم کے کسی عضو کا باہر سے ہی آپریشن کرسکتی ہے۔ اتنے کیمیائی مرکبات دریافت ہوگئے ہیں کہ جن سے کروڑوں دوائیاں بنائی جاتی ہیں جو ناقابل علاج سمجھے جانے والے امراض کا علاج کرتی ہیں۔ دنیا کا کوئی ملک ایسا نہیں جس کے شہروں، گاؤں اور گلی کوچوں میں میڈیکل ٹیکنالوجی اور ادویات استعمال نہ ہو رہی ہوں۔ میڈیکل ٹیکنالوجی کے آلات اور ادویات انسان کی اپنی تخلیق ہیں جو اس نے صدیوں کی محنت اور تجربے سے بنائی ہیں۔ انسانی عقل کو حقیر سمجھنے والی روحانی شخصیات ان کا تعلق خواہ کسی بھی مذہب سے ہو، زندگی بھر انسان کی بنائی ہوئی سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے بھی رہتے ہیں اور انسانی عقل کے ناقص اور قابل نفرت ہونے کا پرچار بھی کرتے رہتے ہیں۔

شہنشاہ جلال الدین اکبر کو دہلی سے لاہور اگر کوئی حکم نامہ بھجوانا ہوتا تھا تو ہرکارے تیز رفتار گھوڑوں کے ذریعے یہ حکم ہفتہ بھر میں لاہور پہنچا دیتے تھے۔ اگر شہنشاہ کو خود لاہور آنا ہوتا تھا تو وہ ہاتھی پر سفر کر کے دو ہفتوں میں لاہور پہنچ جاتا تھا۔ آج کوئی بھی عام شخص ارادہ کرنے کے اگلے ہی لمحے اپنے موبائل فون کے ذریعے پورے گلوب پر جہاں چاہے بات کر سکتا ہے۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں رونما ہونے والے واقعہ کی خبر اگلے ہی لمحے آپ کے گھر میں موجود ٹیلی ویژن پر نشر ہو رہی ہوتی ہے۔

Sanjh Lok Raj

انٹرنیٹ نے دنیا بھر کا علم آپ کی جھولی میں رکھے لیپ ٹاپ کے ذریعے آپ کی پہنچ میں کر دیا ہے مارکو پولو جب اٹلی سے چین کے سفر پر گیا تھا تو 17 سال بعد گھر واپس لوٹا تھا۔ سفر کی جو سہولیات شہنشاہ اکبر اور مارکو پولو کو حاصل نہیں تھیں آج عام آدمی کو میسر ہیں۔ آج کی دنیا تیز رفتار خبر، تیز رفتار سفر اور ساری دنیا پر نظر کی دنیا ہے۔ زمینی سفر، بحری سفر اور ہوائی سفر نے انسان کو سمندر کی تہہ سے لے کر دوسرے سیاروں کا مسافر بنا دیا ہے۔ زمین کا کوئی گوشہ اب انسان کی آنکھ سے اوجھل نہیں ہے۔ یہ سب کچھ سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے ممکن ہوا اور سائنس اور ٹیکنالوجی انسان کی اپنی تخلیق ہے۔ دنیا بھر کے علماء، اپنے اپنے مذاہب کے پرچار کے لیے انٹرنیٹ، موبائل، ٹی وی چینل تک استعمال کرتے ہیں تا کہ لوگوں کو بتا سکیں کہ انسانی عقل ناقص ہے اور مسائل حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

ایک وقت تھا کہ مون سون کی بارشوں کی وجہ سے دریا بپھر کر آبادیوں کو نیست و نابود کر دیا کرتے تھے۔ فصلوں کو برباد کر دیتے اور مویشیوں کو بہا کر لے جاتے تھے۔ ابتدائی لوگ سیلاب کی تباہ کاریوں سے اتنے خوفزدہ تھے کہ وہ دریاؤں کو ناراض دیوتاؤں کا روپ سمجھتے تھے۔ دریائے گنگا اور دریائے نیل کی ناراضگی سے بچنے اور انہیں زرخیزی بڑھانے پر آمادہ کرنے کے لیے مذہبی رسمیں ادا کی جاتی تھیں اور گیت گائے جاتے تھے۔ وہ لوگ جو ان دریاؤں کو دیوتا سمجھ کر نسل در نسل پانی کے بہاؤ کی طاقت سے ڈرتے آئے ہیں وہ تو آج بھی گنگا میں نہا کر اپنے گناہوں سے مکتی حاصل کر رہے ہیں۔ کچھ دوسرے لوگ جو انسان کی عظمت پر یقین رکھتے تھے اور مسائل کو حل کرنے کی انسانی عقل کی صلاحیتوں پر بھروسہ رکھتے تھے انہوں نے پانی کے بہاؤ کی طاقت کو نہروں میں تقسیم کر کے دریا کی زور آوری کو اپنے کنٹرول میں کیا۔ نہروں سے ندی نالے بنائے اور دور دراز کے علاقوں کو پانی سے سیراب کر کے فصلیں اگائیں۔ دوسری طرف پانی کے بہاؤ کی طاقت کو مشینوں کے ذریعے بجلی میں منتقل کیا۔ زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جس کا بجلی پر انحصار نہ ہو۔ کارخانے اور فیکٹریاں پیداوار کے لیے بجلی ہی پر منحصر ہیں۔ یہاں تک کہ دنیا بھر کے مذاہب خواہ وہ آپس میں ایک دوسرے کے کتنے ہی دشمن کیوں نہ ہوں اپنی اپنی عبادت گاہوں کو جگمگانے اور انہیں نوری دلہن بنانے کے لیے بجلی کا استعمال کرتے ہیں۔ بجلی نہیں پوچھتی کہ یہ کعبہ ہے یا بت خانہ؟ سب پر ایک جیسا نور

Sanjh Lok Raj

برساتی ہے۔

آپ اپنے ارد گرد نظر دوڑایئے عمارتی مشینری، نہریں کھودنے سڑکیں بنانے، فصلیں کاٹنے کی بڑی بڑی مشینوں کے علاوہ آپ کے ذاتی استعمال کی چھوٹی چیزیں جیسے لیپ ٹاپ، موبائل فون، موٹر سائیکل وغیرہ یہ سب چیزیں مادی چیزیں ہیں جو انسان نے اپنی ضرورتوں کو پورا کرنے لیے بنائی ہیں۔ یہ آدھا سچ ہے۔ انسانی عقل بھی ضرورت کی ان چیزوں کو پیدا کرنے کے دوران ہی پیدا ہوئی اور پروان چڑھی ہے۔ یہ دوطرفہ عمل ہے یعنی ضرورت کی چیزیں تخلیق کرنے کے دوران عقل کا پیدا ہونا اور عقل کا چیزیں تخلیق کرنا۔ اس تخلیقی عمل کے دوران خود انسان اور مادی دنیا پر کام کرنے سے جو تصورات تخلیق ہوتے ہیں انہیں علم کہتے ہیں۔

انسان کی مادی پیدوار سے نظر ہٹا کر چند ایسی چیزوں پر غور کریں جو مادی وجود نہیں رکھتیں۔ یہ وہ ادارے ہیں جو انسانوں نے اپنی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے بنائے ہیں۔ اگرچہ یہ سماجی ضرورتیں غیر مادی ہیں لیکن اُن کے حصول کے لیے مادی جسم بنایا گیا ہے۔ جیسے انصاف کا اپنا مادی وجود نہیں لیکن عدل و انصاف کے حصول کے لیے عدالتیں، قانون، جج، قانون نافذ کرنے والے ادارے ایک مادی وجود رکھتے ہیں۔

جیسے تعلیم ایک غیرمادی شے ہے لیکن تعلیم کے حصول کے لیے، سکول، کالج، یونیورسٹیاں، کتابیں، اساتذہ اور متعلقہ ادارے، صحت اور علاج کے لیے ہسپتال، ڈسپنسریاں، فارمیسی، میڈیکل ٹیکنالوجی، ڈاکٹر اور پیرامیڈیکل سٹاف، تجارت ومعیشت کو کنٹرول کرنے کے لیے کئی ادارے جیسے بنکاری کا نظام، سٹاک ایکسچینج، چیمبر آف کامرس، ایکسپورٹ اور امپورٹ بیوروکسٹمز، زرمبادلہ کے ذخائر وغیرہ۔ یہ سب ادارے انسان نے اپنے سماجی مسائل کو حل کرنے کے لیے بنائے ہیں۔ اسی طرح ریاست کا قیام، عالمی ادارے جو دنیا بھر کے ممالک کے معاملات سے متعلق ہیں انسانی تخلیق ہیں۔ ان اداروں کو قائم کرنے اور ان سے متعلقہ نظاموں کو تخلیق کرنے کے دوران جو تصورات پیدا ہوئے وہ سماجی علم ہے جس کو سماجی سائنس کہتے ہیں۔ زبان، گرائمر، شعروادب، فلسفہ اور تاریخ سب انسان کی تخلیق ہیں۔ انسان کی بنائی ہوئی ہر چیز سیکولر ہے۔ علم کے خزانے انسان کی تخلیق ہیں انسان کا پیدا کیا ہوا علم سیکولر

Sanjh Lok Raj

تعلیم ہے یہاں تک کہ الہامی کتابیں بھی انسان کے بنائے ہوئے کاغذ پر انسان کی بنائی ہوئی چھپائی کی مشینوں کے ذریعے چھپ کر آمدورفت کے نقل وحمل کے جدید ذرائع جیسے ٹرین جہاز پر ہم تک پہنچتی ہیں۔

تعلیم ہوتی ہی سیکولر ہے جس کو انسان نے پیدا کیا ہے۔ جو مسلسل نشوونما پاتی رہتی ہے۔ اس میں لوگ وقت کے ساتھ ساتھ اضافہ کرتے رہتے ہیں۔ اس پر تنقید ہوتی رہتی ہے۔ تعلیم کو تجربی تصدیق سے غلط یا صحیح ثابت کیا جاتا ہے۔ جبکہ مذہبی تعلیم ان معنوں میں تعلیم نہیں کہلا سکتی وہ عقید ہوتا ہے۔ جاننے کو آپ ٹیسٹ میں ڈال سکتے ہیں ماننے کو آپ کو صرف ماننا ہوتا ہے۔ سائنسی رویہ اور سیکولر سوچ کا ایک ہی مطلب ہے۔ سائنسی رویہ اور سیکولر تعلیم کو ہی سائنسی نظریہ تعلیم کہتے ہیں۔ مابعدالطبیعاتی نظریہ تعلیم معاشروں کو پسماندہ رکھنے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں چند آدمیوں میں بیٹھے ہوئے آپ بھولے سے بھی یہ بات کر بیٹھیں کہ یورپی ملکوں کا مقامی حکومتوں کا نظام نچلی سطح پر مسائل کو حل کرنے کی انسان کی بہتری تخلیق ہے یا یہ کہہ بیٹھیں کہ انسانی عقل نے انٹرنیٹ کے ذریعے عام آدمی کو پوری دنیا سے جوڑ کر کمال کر دکھایا ہے۔ تو فوری طور پر آپ پر تنقید کی بوچھاڑ ہو جائے گی۔ کوئی کہے گا کہ یہ قیامت کی نشانی ہے، کوئی کہے گا کہ دنیا بھر کے سائنس دان مل کر بھی مچھر کا ایک پر نہیں بنا سکتے۔ کوئی کہے گا کہ عقل شیطانی چرخہ ہے، کوئی علامہ اقبال کا شعر سنا دے گا کہ عقل عیار ہے، کوئی یہ واقعہ سنا دے گا کہ ایک نوجوان عقل کی بڑی بڑی باتیں کیا کرتا تھا اس پر چھت گر گئی اور وہ جوانی ہی میں مر گیا۔ کوئی یہ کہہ دے گا کہ کئی گذشتہ قوموں نے آج کے زمانے کی سائنس سے بھی زیادہ ترقی کر لی تھی بس تباہ ہو گئیں وغیرہ۔

ظاہری طور پر یہ بحث عقل کے موضوع پر ہو رہی ہے لیکن حقیقت میں یہ بحث سائنسی نظریہ تعلیم اور مابعدالطبیعاتی نظریہ تعلیم کے دلائل کی بحث ہے۔ مابعدالطبیعاتی نظریہ کے بانی افلاطون کے مطابق عام آدمی علم حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا کیونکہ عقل ناقص ہے خاص لوگ ہی علم حاصل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اصلی علم روح کے پاس ہوتا ہے عقل تو صرف ظاہری چیزوں کو دیکھ سکتی ہے اس کے برعکس سائنسی نظریہ تعلیم کے مطابق عقل

Sanjh Lok Raj

ہی یہ صلاحیت رکھتی ہے کہ وہ علم حاصل کرے اور پھر تصدیق کرے کہ کیا اس کا حاصل کیا ہوا علم درست ہے یا نہیں۔

اپنی طرف سے بنائی گئی ایک مثالی بحث کے ذریعے ہم سائنسی نظریہ تعلیم اور مابعدالطبیعاتی نظریہ تعلیم کے بنیادی اختلاف اور دلائل دینے کے طریقہ کار کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سائنسی نقطۂ نظر کا حامل ایک شخص کہتا ہے کہ2+2 = 4 ہوتے ہیں۔ وہ اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے پہلے دو کتابیں میز پر رکھتا ہے پھر ان پر دو کتابیں رکھ دیتا ہے اس طرح وہ آپ کو مشاہدہ کروا کر یہ ثابت کرتا ہے کہ2+2 = 4 ہوتے ہیں۔ اپنے دعویٰ کو سچ ثابت کرنے کا اس کا یہ طریقہ تجربیت(Empiricism) کہلاتا ہے اس طرح کوئی بھی شخص کہیں بھی اپنے گھر میں یہ تجربہ دہرا کر ثابت کر سکتا ہے کہ2+2 = 4 ہوتے ہیں۔

مابعدالطبیعاتی نقطۂ نظر کا حامل ایک شخص کہتا ہے کہ2+2 = 5 ہوتے ہیں۔ وہ اپنے اس دعویٰ کو تجربیت سے تو ثابت نہیں کر سکتا۔ وہ اپنے دعویٰ کو دلائل سے ثابت کرنے کی کوشش کرے گا اس طریقہ کو عقلیت(Rationalism) کہتے ہیں۔ اب چونکہ یہ بات کہ 2+2=5 ہوتے ہیں عقل میں آنے والی نہیں اس کے لیے وہ اپنے دعویٰ کو غلط سمجھنے کی بجائے انسانی عقل کو غلط کہے گا کہ انسانی عقل اتنی ناقص ہے کہ2+2=5 کو نہیں سمجھ سکتی۔

دوسری دلیل یہ کہ جہاں عقل کی حد ختم ہوتی وہاں2+2=5 کو سمجھنے کی حد شروع ہوتی ہے۔ ہر مابعدالطبعیاتی دعویٰ کی حد وہاں سے شروع ہوتی ہے جہاں عقل کی حد ختم ہوتی ہے۔ تیسری دلیل یہ کہ خاص لوگ جو صدیوں بعد پیدا ہوتے ہیں وہ2+2=5 کو سمجھتے ہیں عام لوگ چونکہ گھٹیا ہوتے ہیں ان کی عقل میں یہ بات نہیں آ سکتی۔

چوتھی دلیل یہ ہو سکتی ہے کہ چند لوگوں نے مان لیا کہ2+2=5 ہوتے ہیں انہیں ہیروں کا خزانہ ملا اور چند دوسرے لوگوں نے یہ نہیں مانا کہ2+2=5 ہوتے ہیں وہ زلزلے کی وجہ سے گرنے والی چھت کے نیچے آ کر مر گئے۔

اس طرح سائنسی سوچ یا سیکولر تعلیم ہمہ گیر ہوتی ہے ہر انسان کی دسترس میں ہوتی ہے۔ ہمہ گیر کو ایک مثال سے سمجھتے جیسے پیناڈول کی گولی بخار کو آرام دیتی ہے۔ بخار خواہ

Sanjh Lok Raj

مسلمان کو ہو یا کافر کو، اونچی ذات والے کو ہو یا نیچی ذات والے کو۔ کالے کو ہو یا گورے کو۔ مرد کو ہو یا عورت کو۔ فرانسیسی بولنے والے کو ہو یا پنجابی بولنے والے کو ہر انسان کو بخار سے آرام دیتی ہے یہ ہے ہمہ گیر۔ اس لیے پیناڈول کی گولی بھی سیکولر ہے۔

Sanjh Lok Raj

طبقاتی نظریئے

ہم نے اپنی زندگی کے ابتدائی سالوں میں اپنی زندگی کی کتاب سے ہی بہت کچھ ایسا سیکھ لیا ہوتا ہے جو آئندہ زندگی میں ہمیں درست نتیجے اخذ کرنے میں مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں کہ مختلف لوگوں کا رہن سہن ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتا ہے۔ کچھ لوگ کچھ بھی نہیں کرتے یعنی کسی معاشی سرگرمی یا پیداواری عمل میں حصّہ نہیں لیتے پھر بھی وہ زندگی کی جدید ترین آسائشوں سے مالا مال ہوتے ہیں اور کچھ لوگ دن رات محنت کرتے ہیں مگر دو وقت کی روٹی بھی پوری نہیں کر پاتے۔ کچھ لوگوں کے بچوں کے کھلونے غیر ملکوں سے آتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے بچوں کی بچپن کی بھولی بھالی خواہشات کو پورا کرنا تو درکنا انہیں بچپن ہی میں محنت مزدوری پر لگانے پر مجبور ہوتے ہیں۔ کچھ لوگوں کو اندرون ملک اور بیرون ملک تعلیم کی سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ جبکہ اکثریت کے بچوں کو سکول تک جانا نصیب نہیں ہوتا۔ صحت کی سہولتیں ہر طبقے کے لیے الگ الگ ہیں کچھ لوگ بیرون ملک دنیا کے بہترین ہسپتالوں سے علاج کرواتے ہیں اور کچھ لوگ دوائی خریدنے کے لیے پیسے نہ ہونے کی وجہ سے تعویذ اور پھونک پر گزارا کرتے ہیں۔ روزگار کے مواقع سب کے لیے ایک جیسے نہیں۔ پولیس کا رویہ مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف ہے۔ کسی سیانے کا قول ہے کہ قانون مکڑی کے جال کی طرح ہے امیر آدمی اس جال کے دھاگوں کو توڑ کر پھینک دیتا ہے جبکہ غریب آدمی کے لیے یہ دھاگے لوہے کی زنجیروں سے بھی زیادہ مضبوط ہوتے ہیں۔

چونکہ ہم پیدا ہی ایک طبقاتی معاشرے میں ہوئے ہیں اور ایسے معاشروں میں پیدا ہونے والے لوگ جب تک زندگی کا شعور حاصل کرتے ہیں تب تک معاشرے کے طبقاتی عوامل کے اتنے عادی ہو چکے ہوتے ہیں جتنے بارش، آندھی، گرمی، سردی اور دھوپ کے۔

یہاں تک کہ معاشرے کے طبقاتی ہونے کی وجہ سے ہونے والی ناانصافیوں اور زیادتیوں کو ایک معمول کی بات سمجھ کر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اپنی زندگی کے انہی تجربات کی وجہ سے، کسی فلسفی یا پیشوا کی تصدیق کے بغیر ہم اس سادہ سی حقیقت کو سمجھ سکتے ہیں کہ معاشرے کی طبقاتی ساخت ہی وہ بنیاد ہے جس پر اس کے معاشی، سیاسی، انتظامی اداروں، آئین و قانون، تعلیم و نظریات یہاں تک کہ لوگوں کے درمیان آپسی تعلقات کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔

ایک طرح سے روزی کمانے والے لوگ ایک طبقہ ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی ذہنی محنت فروخت کرتے ہیں جیسے اساتذہ، وکیل کچھ لوگ اپنی جسمانی محنت فروخت کر کے روزی کماتے ہیں جیسے فیکٹریوں میں کام کرنے والے مزدور، مکینک وغیرہ۔ کچھ لوگ کھیتوں میں کام کر کے روزی کماتے ہیں۔ یہ طبقے محنت کش طبقے یا عوام کہلاتے ہیں۔

چند لوگ جو ذرائع پیداوار کے مالک ہوتے ہیں جیسے جاگیروں کے مالک جاگیردار طبقہ اور کارخانوں کے مالک سرمایہ دار طبقہ کہلاتے ہیں۔ یہ سارے طبقے مل کر معاشرے کا مادی وجود بناتے ہیں۔ ذرائع پیداوار کا مالک طبقہ ہی طبقاتی معاشرے کا حکمران طبقہ ہوتا ہے جسے اشرافیہ بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن ایسا معاشرہ جس میں حکمرانی کا سارا ڈھانچہ کسی کالونیل طاقت نے تعمیر کیا ہو۔ وہاں فوج، بیوروکریسی عدالتیں بھی حکمران طبقے میں شامل ہوتی ہیں۔

تاریخی تجربے سے یہ ثابت ہو گیا ہے کہ دنیا میں موجود تمام علوم، نظریات، عقائد اور فنون کی نوعیت بھی طبقاتی ہوتی ہے۔ کسی بھی طبقاتی معاشرے میں یہ نظریات یا علوم کسی ایک یا دوسرے طبقے کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ حکمران طبقے مابعدالطبیعاتی نظریہ اور عقائد کی سرپرستی کرتے ہیں انہیں قومی مقاصد کے حصول کا نام دے کر میڈیا اور نظام تعلیم کے ذریعے عام کرتے ہیں۔ تاثر یہ دیا جاتا ہے کہ یہ نظریات ملک میں بسنے والے سب لوگوں کے ہیں۔ کیا امیر کیا غریب۔ کیا آقا کیا غلام کیا محتاج کیا غنی یہ سب کا نظریہ ہے۔

دوسری طرف محنت کش طبقے کے حق میں سوچنے والے لوگ سیکولر تعلیم اور سائنسی نظریات کی ترویج کرتے ہیں۔ یہ علوم و نظریات بڑی خاموشی سے ایک طبقے کے مفادات کی دوسرے طبقے کے مفادات کے خلاف فکری صف آرائی کرتے رہتے ہیں۔

کسی بھی معاشرے میں سماجی تبدیلی کی پہلی لڑائی فکری میدان میں لڑی جا رہی

Sanjh Lok Raj

ہوتی ہے۔جس معاشرے میں فکری لڑائی نہ ہو رہی ہو تو سمجھ لینا چاہیے کہ حکمران طبقوں کے جمودی علوم ونظریات نے معاشرے کو فتح کر لیا ہوا ہے۔

آج کل آپ سرکاری اور پرائیویٹ ٹی وی چینلز پر ماہرین علم النجوم کو دن کی نشریات کا آغاز کرتے ہوئے دیکھتے ہوں گے۔ جو اپنے سامنے پڑے ہوئے لیپ ٹاپ سے نہ صرف آپ کی زندگی کے حالات اور کاروباری معاملات کے بارے میں بتاتے ہیں بلکہ ستاروں کے ذریعے ملک کی آئندہ سیاسی صورت حال سیاست دانوں کے عروج وزوال، ملک کے داخلی و خارجی معاملات جیسے دیگر مسائل کے علاوہ منتخب اسمبلیوں کی مدت کے بارے میں بھی پیش گوئیاں کرتے نظر آتے ہیں۔ بڑے بڑے قومی اخباروں کے میگزین آپ کو بتاتے ہیں کہ ''آپ کا یہ ہفتہ کیسا گزرے گا'' بہت سے لوگ ہاتھ کی لکیروں کے ذریعے قسمت کا حال معلوم کرنیوالے علم پامسٹری پر اتنا پختہ یقین رکھتے ہیں کہ کئی پامسٹوں کی پیش گوئیاں بار بار غلط ثابت ہونے کے باوجود کسی سچے پامسٹ کے متلاشی رہتے ہیں۔انگوٹھی میں کون سا پتھر پہننے سے آپ کی شخصیت پر کیا اثرات مرتب ہوں گے یہ بھی ایک علم ہے۔اب تو ان لوگوں نے گھر بیٹھے ہی یہ کہہ کر مابعدالطبیعاتی قیاس آرائیوں کو سائنس کا درجہ دے دیا ہے کہ پتھروں میں سے شعائیں نکلتی ہیں جو آپ کی شخصیت پر اثر انداز ہوتی ہیں۔کون سا نمبر آپ کے لیے خوش قسمتی کا باعث بنے گا یہ بھی ایک مابعدالطبیعاتی قیاس آرائی ہے۔ یہ اور اسی طرح کے دوسرے قیاسات جنھیں علوم کہہ کر پکارا جاتا ہے ان کی چھاپ ہمارے معاشرے پر اتنی ہے کہ مابعدالطبیعاتی قیاس آرائیوں کو نہ ماننے والے کو معاشرے میں باغی قسم کا شخص اور اشراف دشمن سمجھا جاتا ہے۔

اگر ہم تھوڑا سا غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ بظاہر معصوم اور بے ضرر نظر آنے والے یہ قیاسی علوم کس طرح معاشرے کو جامد رکھنے کا سبب بنتے ہیں اور ان کا پیدا کیا ہوا ذہنی جمود کس طرح حکمران طبقے کے مفادات کی حفاظت کا سامان مہیا کرتا ہے۔

اب ذرا دیکھیں کہ یہ مابعدالطبیعاتی علوم جمود کیسے پیدا کرتے ہیں؟ ان تمام جمودی علوم کی بنیاد اس قیاس پر ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اوّل تا آخر پہلے سے طے شدہ ہے۔جن لوگوں کے ہاتھ میں دولت کی لکیر ہے انھیں کسی نہ کسی بہانے دولت مل کر ہی رہنی

Sanjh Lok Raj

ہوتی ہے۔ اور جن کے ہاتھ میں یہ لکیر نہیں وہ چاہے جتنی بھی کوشش کر لیں انھیں کچھ نہیں ملنے والا ہوتا۔ ان کے مطابق تعلیم، روزگار اور علاج سے محروم لوگوں کی پسماندگی میں کسی معاشی سسٹم اور سیاسی نظام کا کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ بس یہ ان کے ستاروں کا چکر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ستارے اتنی دور ہیں کہ ان کے چکر کو روکنا انسان کے بس کی تو بات ہی نہیں۔ اس قسم کے قیاسی علوم کی سر پرستی اس لیے کی جاتی ہے کہ انسان کی اپنی محنت۔ مستقبل کے لیے منصوبہ بندی۔ سعی و خطا کے عمل سے سیکھ کر آگے بڑھنے کی صلاحیت کو بے کار اور بے نتیجہ ثابت کیا جائے اگر آپ اپنی قسمت تبدیل کروانا چاہتے ہیں تو زیادہ سے زیادہ آپ یہ کر سکتے ہیں کہ فلاں قسم کا پتھر فلاں قسم کی دھات میں جڑوا کر پہن لیں۔

ایسے قیاسی علوم پر یقین کرنے کی وجہ سے لوگ سماجی بے انصافیوں، سماج کی حرکت حکمران طبقے کا کردار، حالات و واقعات کے رونما ہونے کی مادی وجوہات، قوموں کے عروج و زوال کے قوانین کی طرف توجہ دینے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کا اپنے ارادے اور محنت پر بھروسہ ختم ہو جاتا ہے۔ ایسے قیاسی مابعدالطبیعاتی علوم حکمران طبقے کی دو طرح سے مدد کرتے ہیں۔

- یہ کہ حکمران طبقہ کسی غاصبانہ نظام کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے ستاروں کی وجہ سے ہم پر حکمران ہے۔
- دوسرے یہ کہ محکوم طبقات جتنی بھی کوشش کر لیں وہ نہ تو اپنے حالات میں کوئی تبدیلی لا سکتے ہیں اور نہ ہی سماج میں کوئی بہتری پیدا کر سکتے ہیں۔

یہی نہیں طبقاتی معاشروں میں قصے کہانیاں اور کچھ من گھڑت واقعات چند خاص مقاصد کو سامنے رکھ کر تخلیق کیے جاتے ہیں۔ مشاہدے کو نظر کا دھوکا قرار دینا۔ محنت اور کوشش کو خدا پر کمزور ایمان کی علامت ثابت کرنا۔ اپنی طرف سے بنائے گئے واقعات میں قوانین قدرت کو اس طرح ٹوٹتے ہوئے دکھانا جیسے سائنس کے اٹل قوانین قدرت کا ایک مذاق ہو۔ عقل میں نہ آنے والوں باتوں کو نہ ماننے والوں کے متعلق ایسی کہانیاں تخلیق کرنا کہ جس سے یہ ثابت ہو کہ ایسا کرنے والے سے خدا ناراض ہو جاتا ہے۔ ان پر طرح طرح کی مصیبتیں نازل ہوتی ہیں اور مابعدالطبیعات قیاس آرائیوں پر یقین کرنے والے کو کیسے کیسے انعام و اکرام سے نوازا جاتا ہے۔

Sanjh Lok Raj

آپ نے بچپن میں یہ کہانی ضرور سنی یا پڑھی ہوگی جس میں انسانی کوشش اور لگن کے علاوہ کسی اور خوبی کو کامیابی کا ذریعہ ثابت کیا گیا ہے۔ وہ یہ کہ لکڑ ہارے کا کلہاڑا لکڑیاں کاٹتے ہوئے دریا میں گر گیا۔غریب لکڑ ہارا دریا کے کنارے بیٹھا رو رہا تھا کہ ایک فرشتہ آیا۔

وہ فرشتہ دریا سے سونے کا ایک کلہاڑا نکال کر لایا اور لکڑ ہارے کو دیا۔لکڑ ہارے نے یہ کلہاڑا اس لیے لینے سے انکار کر دیا کہ یہ کلہاڑا اس کا نہیں تھا۔ پھر فرشتے نے دریا میں ایک اور غوطہ لگایا اور اس بار چاندی کا ایک کلہاڑا لے کر آیا۔مگر لکڑ ہارے نے اپنی دیانتداری کی وجہ سے یہ کلہاڑا لینے سے انکار کر دیا۔تیسری دفعہ فرشتہ لوہے کا کلہاڑا نکال لایا جو لکڑ ہارے نے خوشی خوشی قبول کر لیا۔ تب فرشتے نے لکڑ ہارے کی ایمانداری سے خوش ہو کر تینوں کلہاڑے اس کو انعام میں دے دیئے۔

ایسی کہانیاں کم پڑھائی جاتی ہیں جن میں کسی انسان کی مسلسل محنت کے نتیجے میں کوئی ایسی کامیابی حاصل ہوئی ہو جس سے دیگر انسانوں کو بھی بہت فائدہ پہنچا ہو۔ جیسے ایجادات کی کہانیاں۔ بلب ایک ایسی ایجاد ہے کہ اندھیرا ہوتے ہی پوری دنیا قمقموں کی روشنی سے جگمگا اُٹھتی ہے۔ بلکہ ہم مذہبی تہواروں پر انہی بلبوں سے چراغاں کر کے ثواب بھی حاصل کرتے ہیں۔ بلب کی ایجاد کے پیچھے ایک طویل کہانی ہے۔ بہت سی ناکامیاں، مسلسل جدوجہد اور پھر کامیابی ہے۔لیکن ایسی ایجادت کے بارے میں ایسی کہانیاں گھڑی جاتی ہیں تاکہ انھیں حادثاتی ثابت کیا جائے۔ ثابت کیا جائے کہ ایسی ایجادات ضرورتوں کے تابع نہیں بلکہ اچانک وجود میں آ جاتی ہیں۔

سماجی سائنسدانوں کے بارے میں بھی ایسی ہی کہانیاں مشہور کی جاتی ہیں کہ وہ بچپن سے اتنے شرمیلے تھے کہ لوگوں کو دیکھ کر چارپائی کے نیچے چھپ جاتے تھے لیکن انھوں نے ایسا سماجی نظریہ تخلیق کیا کہ جو معاشرے کے مسائل کے حل کرنے میں مددگار ثابت ہوا۔ سائنسدانوں کے بارے میں بھی ایسی باتیں مشہور کی جاتی ہیں کہ وہ جنگل میں لکڑیاں کاٹنے جا رہے تھے کہ بجلی ایجاد ہوگئی۔سوچ اور خیالات بھی معاشرے ہی کی پیداوار ہوتے ہیں مگر انھیں بھی معاشرے سے لاتعلق ثابت کرنے کے لیے کہانیاں گھڑی جاتی ہیں۔ خیالات ونظریات ایک طرف تو معاشرے کی پیداوار ہوتے ہیں تو دوسری طرف وقت اور حالات کی پیداوار

Sanjh Lok Raj

ہوتے ہیں۔

مابعدالطبیعاتی قیاس آرائیوں اور سائنسی حقائق کا کردار بھی طبقاتی ہے۔ قیاس آرائیاں اور سائنسی حقائق بھی فکری صف آرائی میں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے ہوتے ہیں۔ اس حقیقت کو ہم نظریہ ارتقاء اور نظریہ تخلیق کے درمیان جدل کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہاں ہم ان دونوں نظریات کے متن پر بحث نہیں کر رہے بلکہ ان دونوں نظریات کے طبقاتی کردار اور ان کے معاشرے پر اثرات پر بحث کر رہے ہیں۔

نظریہ بھی بنیادی طور پر فلسفی یا سائنسدان کا قیاس ہوتا ہے مگر تجرباتی شواہد جب اس نظریہ کی تصدیق کر دیں تو یہ سائنسی حقیقت بن جاتا ہے نظریہ ارتقا کو سائنس کے تمام شعبوں کے علاوہ سماجی علوم نے بھی اتنے ثبوت فراہم کیے ہیں کہ اب یہ سائنسی حقیقت بن گیا ہے۔ قانون قدرت ثابت ہو چکا ہے۔

نظریہ تخلیق دراصل مختلف قوموں اور قدیم تہذیبوں میں مروج کائنات اور انسان کی تخلیق کے بارے میں انسان کے اپنے قیاس ہیں۔ قیاس کی خصوصیت یہ ہے کہ ایک انسان کا قیاس دوسرے انسان کے قیاس سے الگ ہوتا ہے۔ اس لیے مصریوں کا نظریہ تخلیق یونانیوں کے نظریہ تخلیق سے الگ ہے۔ جبکہ چینیوں کا نظریہ تخلیق ہندوستان کے نظریہ تخلیق سے الگ ہے۔ ہر قوم کی مائتھالوجی بھی الگ الگ ہے۔ اسی طرح مختلف مذاہب میں انسان اور کائنات کی ابتدا کے بارے میں الگ الگ عقائد موجود ہیں۔ مختلف قوموں اور تہذیبوں میں رائج تخلیق کے نظریات کی تفصیل سبط حسن کی کتاب 'ماضی کے مزار' میں دی گئی ہے۔ تخلیق کے ان تمام نظریات، مائتھالوجی اور عقائد میں ایک چیز مشترک ہے وہ یہ کہ اس نظریہ کے مطابق کائنات اور انسان سمیت جو کچھ بھی وجود رکھتا ہے اس کو اسی صورت میں پیدا کیا گیا ہے۔ جس شکل میں وہ آج ہے ہمیشہ سے ایسا ہی تھا اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ (یہ مابعدالطبیعات کا پہلا اصول ہے) انہیں بدلنا ممکن نہیں۔

قانون فطرت یعنی قانون ارتقا یہ ہے کہ کائنات میں انسان سمیت جو کچھ بھی وجود رکھتا ہے۔ وہ اندرونی اور بیرونی حالات کے اثر سے مسلسل تبدیلی کے عمل سے گزر رہا ہے۔ اب جو کچھ ہمیں جیسا نظر آ رہا ہے ابتداء میں ایسا نہیں تھا۔ اور نہ آئندہ ایسا رہے گا جیسا اب

Sanjh Lok Raj

ہے۔ ہر شے ہر لمحے بدل رہی ہے۔

طبقاتی سماج میں دوطرح کی قوتیں موجود ہوتی ہیں۔ایک وہ جوسماج کی غیر متبدل حالت اور انجماد میں اپنے آپ کو محفوظ سمجھتی ہیں وہ اپنے مفاد کی خاطر معاشرے کو جامد رکھنے کا کام نظریہ تخلیق سمیت تمام تر مابعداطبیعاتی علوم کو معاشرے پر نافذ کر کے لیتی ہیں۔ یا یوں کہہ لیجیے کہ معاشرے پر مابعدالطبیعات کا نفاذ حکمران طبقے کی حکمرانی کوطوالت بخشتا ہے۔

جبکہ طبقاتی سماج میں دوسری قوت محکوم طبقے۔محنت کش عوام۔ رعایا اور غلام ہوتے ہیں۔جن کا مفاد اس بات میں ہے کہ سماج کے چھوٹے سے طبقے کی غلامی سے نجات حاصل کی جائے اور سماج کو ایک بہت بڑی اکثریت کی بہتری کے لیے تبدیل کیا جائے۔ وہ تبدیلی کے لیے سائنسی سوچ اور مشاہداتی سچائیوں کا استعمال کرتے ہیں۔سائنسی فکر اور قانون ارتقا سماجی تبدیلی کوفطری اور قابل عمل نظریہ ثابت کرتا ہے۔ قانون ارتقاء یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ سماجی تبدیلی اتفاقیہ نہیں ہوتی اس میں انسانی محنت کا بڑا عمل دخل ہے۔تمام سائنسی علوم حالات کو اپنے حق میں بدلنے کے لیے محنت کش طبقے کی راہنمائی کرتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

خالی

Sanjh Lok Raj

دوسرا حصہ

عملی پہلو

غیر رسمی تعلیم
رسمی تعلیم
تعلیم کا نو آبادیاتی ڈھانچہ
تدریس کا حاکمیتی ماڈل
ذریعہ تعلیم
نظریہ تعلیم بطور نظریہ
سیاست
ہمارے تضادات
پیداواری نظام تعلیم
تعلیمی پالیسیاں (1)
تعلیمی پالیسیاں (2)
روحانی تعلیم

Sanjh Lok Raj

خالی

Sanjh Lok Raj

غیر رسمی تعلیم

ہم چونکہ تعلیمی اداروں سے محض ڈگری کے لیے حاصل کی گئی رسمی تعلیم ہی کو تعلیم سمجھنے کے عادی ہیں اس لیے ہم تعلیمی معیار کو بھی تعلیمی ادارے کی شہرت سے منسوب کر دیتے ہیں۔ تعلیمی انحطاط کی بات آئے تب بھی ہم اسے نصاب کی کمزوری۔ طریقہ تدریس میں خامی اور ذریعہ تعلیم پر بحث کر کے مطمئن ہو جاتے ہیں یا زیادہ سے زیادہ اساتذہ کو نااہل قرار دے کر اپنی ذمہ داری سے فارغ ہو جاتے ہیں۔ تعلیم میں عدم دلچسپی۔ رٹا۔ تحقیق سے گریز۔ عقل استعمال کرنے میں سستی۔ حاصل کیے ہوئے علم پر بے یقینی کا سبب دریافت کرنے کے لیے بیوروکریسی پر مشتمل کمشن قائم کرتے ہیں۔ طلباء و اساتذہ کی ورکشاپوں، غیر ملکی ماہرین کے اعزاز میں بلائے گئے سیمینار اور بڑے بڑے ہوٹلوں میں بلائی گئی تعلیمی کانفرنسوں میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سامراجی ممالک کے فنڈ سے نئے تعلیمی منصوبے شروع کرتے ہیں۔ لیکن تعلیمی جمود کے سبب کو ان نقوش میں تلاش کرنے کی کوشش نہیں کرتے جو سکول میں داخل ہونے سے پہلے بچے کی ذہن سازی کے دنوں میں اس کے ذہن پر ثبت ہو چکے ہوتے ہیں۔

قبل اس کے بچہ سکول جائے وہ ابتدائی سال جو گھر کے اندر گزرتے ہیں اس کے متعدد رویوں اور اوضاع کو متعین کر چکے ہوتے ہیں۔ یہ امر ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے کہ بچہ سکول میں اپنے والدین کو بھی ساتھ لاتا ہے ان معنوں میں کہ والدین کی دی ہوئی تعلیم اور اردگرد سے حاصل کیے ہوئے خیالات اس کے ذہن وضمیر پر ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ گھر اور سکول کی تعلیم میں کوئی تصادم ہو تو اس کا نتیجہ ذہنی جمود کی صورت میں نکلتا ہے۔

تحلیل نفسی کے ماہرین ہمیں بتاتے ہیں کہ بنیادی رویّے ابتدائی بچپن میں صورت پذیر ہوتے ہیں بچے کے اندرونی تحفظ یا بے اطمینانی کے احساسات۔ اس کی تجسس پسندی کی

Sanjh Lok Raj

نوعیت یا اس میں پہل کرنے کی صلاحیت کے فقدان کو ان رویوں کی مثالیں قرار دیا جا سکتا ہے۔تجسس پسندی اور سلامتی کا احساس رکھنے والا بچہ جس قسم کی زندگی گزارے گا اور جن رویوں کا اظہار کرے گا۔خوفزدہ کر کے شرارتوں سے روکا گیا بچہ سوال کرنے پر ڈانٹ پلایا گیا بچہ اور زندگی کی رعنائیوں سے بے حس کیا گیا بچہ کبھی اتنی کامیابیاں حاصل نہیں کر پائے گا۔

بچے کی سب سے پہلی درسگاہ ماں کی گود ہے اور وہ جوں جوں بڑا ہوتا ہے اس کے سیکھنے اور اس کو سکھانے والوں کی دنیا بھی بڑی ہوتی چلی جاتی ہے۔ ماں کی گود، گھر، خاندان، گلی محلے کے دوست ، مذہبی ادارے، عبادت گاہیں، سماجی خدمت کے ادارے، سماج کی مشہور شخصیتیں، سماجی ضابطے اور رسم و رواج، عدالتیں، پولیس اور فوج، سینما ہال، تھیٹر اور میڈیا یہ سب تعلیمی ادارے ہیں۔ ان کے ذریعے تعلیم جاری رہتی ہے۔ یہ ادارے جان بوجھ کر تعلیم نہیں دیتے۔اس لیے جب کوئی شخص کسی ارادے یا شعوری کوشش کے بغیر معلومات حاصل کرتا ہے تو اسے غیر شعوری تعلیم کہا جاتا ہے اسے غیر رسمی تعلیم کہتے ہیں۔ غیر رسمی تعلیم اور رسمی تعلیم میں تصادم تعلیم پر بے یقینی اور مستقبل میں بہتری کے امکانات سے لاتعلقی کی صورت میں نکلتا ہے۔

شعور سے مراد ادراک کی مسلسل تربیت ہے۔ جب بچہ ماحول کا شعوری یا غیر شعوری مشاہدہ کرتا ہے تو یہ مشاہدہ اس کی سوچ پر مسلسل اثر انداز ہوتا ہے۔ زندگی کا ہر واقعہ اس کے ذہن پر اثرات مرتب کرتا رہتا ہے۔ والدین جو موروثی اوصاف کو بچوں میں منتقل کرتے ہیں خود بھی ماحول کا اہم جزو ہوتے ہیں۔

تجسس علم کا وسیلہ ہے۔ انسان تجسس ہی کی وجہ سے اپنے مشاہدے اور تجربے کو وسعت دیتا ہے اور علم کو آگے بڑھاتا رہتا ہے۔ بچے کا تجسس بچے کے ذہن میں کئی سوالات پیدا کرتا ہے۔ بچہ کئی ایسے سوالات کرتا ہے جس کا جواب یا تو انہیں غلط ملتا ہے یا بعض دفعہ انھیں جواب کی بجائے ڈانٹ پلا دی جاتی ہے۔ ایسے واقعات سے بچے کا ذہن تو اگرچہ کام کرتا رہتا ہے مگر زبان خاموش ہو جاتی ہے۔ زبان کی خاموشی کا نتیجہ بچے کے تجسس کی موت کی صورت میں نکلتا ہے۔بچپن ہی میں تجسس کا گلا دبا کر مار دیئے جانے سے بچہ ساری زندگی کے لیے خاندان اور ریاست کی مسلط کی گئی سوچوں کا اطاعت گزار بن کر رہتا ہے۔

بچے اپنی نشو ونما کے دوران وہی طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جو بالغوں کی نظر میں

زیادہ تعریف وستائش کا مستحق ہوتا ہے۔ بچہ ابھی چند الفاظ بولنے ہی لگتا ہے کہ بڑی بہن اسے کلمہ یاد کروا دیتی ہے۔ پھر گھر میں مہمانوں کے آنے پر بچے سے کہتی ہے کہ کلمہ سناؤ۔ بچہ سب کے سامنے کلمہ سناتا ہے تو سب اسے پیار کرتے ہیں۔ چومتے ہیں۔ بچے نے پیار کی زبان سے سیکھ لیا کہ یہ عمل قابل ستائش ہے۔ اسے تائید (Approval) کہتے ہیں۔ اس طرح تائید کے عمل سے بچوں کو وہ کچھ سکھایا جاتا ہے جو بڑوں کو پسند ہے۔ یہی بچہ زمین پر گرے ہوئے سگریٹ کو اُٹھا کر منہ میں رکھ کر سگریٹ پینے کی نقل کرتا ہے تو سبھی لوگ اس پر جھپٹ پڑتے ہیں۔ کوئی آنکھیں نکال کر بچے کو ڈراتا ہے تو کوئی اونچی بول کر بچے کو دھمکاتا ہے۔ بچہ سمجھ جاتا ہے کہ یہ کام ٹھیک نہیں اسے تادیب (Disapproval) کہتے ہیں۔ بچے تائید و تادیب کے عمل سے سیکھتے چلے جاتے ہیں اور بڑوں کی مرضی کے مطابق ڈھلتے چلے جاتے ہیں۔ بالکل اس طرح جیسے ان کے بڑے اپنے بڑوں کی مرضی کے مطابق ڈھال لیے گئے تھے۔ اس طرح یہ سلسلہ تائید و تادیب بچے کو ماضی کے مطابق ڈھالنے کا عمل ہے۔

کوئی بچہ کاغذ پر تصویر بناتا ہے تو سب لوگ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں کہ اگلے جہان اس تصویر میں جان ڈالنی پڑے گی۔ کوئی اونچا ہنستا ہے تو ساتھ والا کہتا ہے کہ ہنسی دل کو مردہ کر دیتی ہے۔ بچہ تھوڑی سی شرارت کرتا ہے تو کسی نہ کسی چیز کے خوف میں مبتلا کر کے اسے شرارت سے روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جن آ جائے گا۔ پولیس والا پکڑ کر لے جائے گا۔ بلی کھا جائے گی۔ نتیجہ یہ کہ بچہ مینڈک اور چھپکلی سے بھی ڈرنے لگتا ہے۔ پھر اخلاق سنوارنے کے لیے بھی خوف کا سہارا لیا جاتا ہے۔ نتیجہ بچہ عدم تحفظ کا شکار ہو کر کسی بھی معاملے میں پہل کاری کی صلاحت سے محروم ہو جاتا ہے۔

بچہ جب گھر سے باہر نکل کر دوستی بناتا ہے تو اسے گھر والوں کی طرف سے ایسی باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ گھٹیا ذات کے بچوں سے کھیلے گا تو اس کی سوچ بھی گھٹیا ہو جائے گی۔ پاکستان کی 70 فیصد آبادی اب بھی دیہات میں رہتی ہے اور زرعی کلچر میں تو ذات پات جزو ایمان سمجھی جاتی ہے۔ حالانکہ ذات پات کا نظام ہندو مذہب کے عقیدہ تخلیق کا لازمی جزو ہے اور حکمران طبقے نے اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے ذات پات کو ہمیشہ زندہ رکھا ہے۔ ذات پات کا نظام ہندوستانی ثقافت کا مابعدالطبیعاتی جزو رہا ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے ہندوستان کے

Sanjh Lok Raj

رہنے والے لوگ پاکستان، ہندوستان یا بنگلہ دیش جہاں کے بھی ہوں اور خواہ وہ مسلمان، ہندو، سکھ یا عیسائی ہوں ذات پات کی بنیاد پر انسان کی خود ساختہ تقسیم اور اس تقسیم کے نتیجے میں کچھ انسانوں سے نفرت کے گھٹیا نظام کی لپیٹ میں ہیں۔

اسلامی عقیدہ تخلیق کے مطابق پوری نوع انسانی بابا آدم اور اماں حوا کی اولاد ہیں۔ مگر قرآن کریم پر ایمان رکھنے کے باوجود ذات پات کی سوچ کی لپیٹ میں ہونا ثقافت کی مذہب پر بالادستی کو ظاہر کرتا ہے۔ وکیل معاشرے کا دانشور طبقہ ہے مگر ہائی کورٹ اور سپریم کورٹ کے وکلا کے ناموں کی تختیاں پڑھ کر آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ ہم کس طرح ہندی ثقافت کے مابعد الطبیعاتی جزو کی جکڑ میں ہیں۔ ثقافت کے اچھے اور برے دونوں پہلو بچے کو اپنے فکری اور عملی سانچے میں ڈھالتے رہتے ہیں۔ ثقافت کوئی غیر شخصی قوت نہیں ہے جو انسانوں کے فکر و عمل سے باہر اپنا کوئی وجود رکھتی ہے۔ انسان خود اپنی ثقافت کا معمار ہے اور ثقافت انسان کی معمار۔ فرد کے سوچنے کا طریقہ وہی ہوتا ہے جو اس کے گروہ کا ہوتا ہے۔

پیر صاحب اپنے بچے کے ساتھ گاؤں میں مریدین کے گھر آتے ہیں۔ گھر کے افراد پیر کے بچے کو اتنا احترام دیتے ہیں کہ ان کے اپنے بچے خود کو بے وقعت اور بے حیثیت سمجھنے لگتے ہیں۔ پیر کے بچے کو اتنا مقدس ثابت کیا جاتا ہے جیسے وہ خود کسی ناپاک چیز سے بنے ہوں۔ وہ اپنے بچوں کو بتاتے ہیں کہ کچھ لوگ ایسے ہیں جن کے بچوں کے کھیلنے کے لیے کائنات ایک کھلونا بنایا گیا ہے۔ یہ لوگ کائنات اور اس کے اندر موجود ہر چیز کے مالک ہیں ان کو خوش کرنے سے خدا خوش ہوتا ہے اور خدا خوش ہو جائے تو انھیں نعمتوں سے مالا مال کر دیتا ہے۔ یہ لوگ اگر کسی سے ناراض ہو جائیں تو خدا ان پر بھوک افلاس، قحط اور سیلاب کے عذاب لاتا ہے۔ اس طرح بچوں کو علم ہو گیا کہ کچھ لوگ مقدس ہوتے ہیں اور اکثریت ناپاک لوگوں کی ہے۔ ناپاک لوگ زندگی میں اپنی محنت سے کتنا ہی کمال کیوں نہ حاصل کر لیں وہ کبھی مقدس لوگوں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہو سکتے۔ اس طرح لوگ نسل در نسل ذاتی بے قدری میں اتنی لذت محسوس کرنے لگتے ہیں کہ وہ اقوام متحدہ کے بنیادی انسانی حقوق کے چارٹر میں تسلیم کی گئی انسانی برابری کو کافروں کا نظام خیال کرتے ہیں۔ اور انسانی برابری کی باتیں کرنے والے کو خدا کا منکر ٹھہراتے ہیں۔ جاگیردار اور رعایا کے درمیان بھی آقا اور غلام کا رشتہ ہوتا ہے۔ لوگ

جاگیردار کے برابر بھی نہیں بیٹھ سکتے۔اس طرح پیر اور جاگیردار رعایا کو اس قدر بے بسی اور بے قدری کا مجسمہ بن کر زندگی گزارنا سکھاتے ہیں جس کی وجہ سے رعایا خود کو پیروں اور جاگیرداروں کی رائے کے مطابق دیکھنا شروع کر دیتی ہیں وہ سمجھنے لگتے ہیں کہ وہ بے کار ہیں نکمے ہیں۔ وہ کچھ نہیں جانتے۔ زمین کا بوجھ ہیں۔ زندگی کا یہ عملی نمونہ دیکھنے کے بعد اسے یقین ہو جاتا ہے کہ کائنات کا سارا نظام خدا نے بڑے لوگوں کے ہاتھ میں دیا ہوا ہے۔

بچہ اپنے والد کے ساتھ اپنی گلی والی مسجد کو چھوڑ کر ہمیشہ پچھلی گلی والی مسجد میں جمعہ پڑھنے جاتا ہے۔ راستے میں اسے بتایا جاتا ہے کہ ہماری گلی والی مسجد کسی دوسرے فرقے کے لوگوں کی ہے اس میں نماز پڑھنے سے ہماری نماز نہیں ہوتی کیونکہ یہ لوگ کافر ہیں۔ دنیا کی آخری سچائی ہمارے پاس ہے۔اس طرح ہم سبھی متبادل عقائد کو غلط مان کر اپنے ذہنی جمود کی حفاظت کرتے ہیں۔ غیر مذہبوں کو واجب القتل سمجھنا تو کیا اپنے ہی ہم مذہب کسی دوسرے فرقے کے لوگوں کا سر تن سے جدا کرنے کے بدلے میں خدا سے جنت کے اُمیدوار ہوتے ہیں۔ اس طرح انسانوں کے درمیان محض تفریق ہی نہیں بلکہ اس خود ساختہ تفریق کی وجہ سے نفرت کے جذبات کی پرورش کرتے ہیں۔نفرت کی اس تعلیم کو لے کر جب آپ کالج یا یونیورسٹی میں جائیں گے تو سماجی علوم آپ کو یہودیوں کی سازش، نصرانیوں کا آپ کو تباہ کرنے کا منصوبہ نظر نہیں آئیں گے تو کیا آپ اس کو ایک سچا علم سمجھ کر اس پر یقین کریں گے؟

گلی کے لڑکوں میں جھگڑا ہوا ہے۔ ایک لڑکے کے والد نے تھانے میں درخواست دے دی۔ جس کی وجہ سے پولیس نے محلے کی 10-8 لڑکوں کو گرفتار کر لیا ہے۔ بچوں کے لواحقین ایک بڑی تعداد میں اکٹھے ہو کر تھانے کے باہر کھڑے ہیں۔ ڈرتے ہوئے تھانے کے اندر نہیں جا رہے کہ کہیں وہ خود بھی کسی کیس میں دھر نہ لیے جائیں۔ اتنے میں ایک بااثر آدمی کا منشی آتا ہے۔ وہ سب لوگوں کو باہر کھڑے رہ کر انتظار کرنے کی ہدایت کر کے اندر چلا جاتا ہے اور تھانیدار کے ساتھ والی کرسی پر براجمان ہو جاتا ہے کیونکہ یہ تھانیدار اس تھانے میں اسی بااثر شخص کی سفارش پر لگایا گیا ہے جس کا منشی اس کے پاس بیٹھا ہے۔ اگلے دن پتہ چلتا ہے کہ چند لڑکوں کو بااثر شخص کے منشی کے کہنے پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ کچھ لڑکے پیسے دے کر چھڑوا لیے گئے ہیں۔ اور چند بچوں کو جیل بھیج دیا گیا ہے۔ اگلے ہفتے پتہ چلا کہ عدالت نے ان لڑکوں

کی ضمانت مسترد کر دی کیونکہ تھانیدار نے ان کے خلاف ضمنی لکھی تھی۔ پھر ہائی کورٹ نے بھی ایسا ہی کیا کیونکہ تھانیدار نے ان کے خلاف ضمنی لکھی تھی۔ اور سب کو علم تھا کہ اصل قصوروار کو با اثر شخص نے چھڑوا لیا تھا۔ اس طرح لڑکوں اور ان کے لواحقین کے ساتھ ساتھ سننے والوں کی تعلیم بھی ہوگئی کہ یہ (Elitisit) ریاست ہے۔ یعنی طبقہ اشرافیہ کی خدمت گار۔ اس لیے جو شخص طبقہ اشرافیہ کی پناہ میں رہے گا وہی محفوظ رہے گا اس طرح ریاست کے تمام ادارے اپنی رعایا کی ان کے بے بس ہونے کی تربیت وتعلیم کرتے رہتے ہیں۔ مسلسل جبر سے بے بسی کے قالب میں ڈھالے گئے لوگ داخلی بے حرکتی کا شکار رہتے ہیں۔ جبر کے خود بخود ختم ہونے کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ بے بسی سے لاتعلقی پیدا ہوتی ہے اور لوگ ہر قسم کی سیاسی و تاریخی تبدیلی سے لاتعلق ہو کر طبقہ اشرافیہ کی من مانی کے لیے جگہ چھوڑ دیتے ہیں۔ اقتدار، دولت اور زندگی کی رعنائیوں پر طبقہ اشرافیہ کا حق سمجھنے لگتے ہیں۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ عام لوگوں کی پسماندگی، بدحالی، بے توقیری اور بے بسی کو مخصوص ماورائی نظریئے کی بنیاد پر قبولیت کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ جب یورپ میں یہ حالات تھے تو پاسکل نے کہا تھا ''لوگ کبھی بھی کسی برائی کی تکمیل اتنی خوشی خوشی نہیں کرتے جتنی کہ وہ کسی مذہب پر یقین کامل ہونے کی صورت میں کرتے ہیں۔'' غیر رسمی تعلیم ہمیشہ حال کو ماضی کے مطابق رکھنے کے لیے ہوتی ہے۔ غیر رسمی تعلیم روایت کی ترسیل ہے اور روایت کی ترسیل ہمیشہ تبدیلی لانے کی خواہش کے متصادم ہوتی ہے۔

رسمی تعلیم

رسمی تعلیم کسی ملک میں رائج نظام تعلیم کو کہتے ہیں اور کسی بھی ملک کا نظامِ تعلیم اس ملک کے سیاسی نظام ہی کا ایک حصہ ہوتا ہے۔حکومت کرنے والے لوگ ہی ملک کی تعلیمی پالیسی بناتے ہیں اور بجٹ میں تعلیم کے لیے رقم بھی وہی مختص کرتے ہیں۔ ہمارے جیسے پوسٹ کالونیل ملک میں فوج۔ بیوروکریسی، کالونیل جاگیردار، فوج اور بیوروکریسی کا پیدا کردہ صنعت کار طبقہ ملک کا حکمران طبقہ ہوتا ہے۔حکمران ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کس طبقے کو تعلیم دینی ہے اور کس طبقے کو تعلیم سے دور رکھنا ہے۔حکمران طبقے کے بچوں کو کس طرح کی تعلیمی مراعات دینی ہیں اور رعایا کو تعلیمی لحاظ سے کس سطح پر رکھنا ہے۔ یہاں رعایا کا لفظ اس لیے استعمال کیا گیا ہے کہ پوسٹ کالونیل ریاست میں رہنے والے لوگوں کی حیثیت شہری کی نہیں ہوتی جو جدید ریاست میں تصور کی جاتی ہے۔

تعلیم کا بذات خود کوئی مقصد نہیں ہوتا۔مقصد لوگوں کا ہوتا ہے جو تعلیم نافذ کرتے ہیں یعنی حکمران طبقے کے حکمران نظام تعلیم کو اسطرح وضع کرتے ہیں کہ وہ موجودہ سیاسی و اقتصادی نظام کو بچائے رکھنے میں مدد دے۔ جو طبقہ ریاست پر قابض ہوتا ہے وہ اپنے مقاصد کو نظام تعلیم کے ذریعے لوگوں پر مسلط کرتا ہے۔انہیں قومی مقاصد کا نام دیا جاتا ہے جب کہ قومی مقاصد دراصل حکمرانوں کے مفادات ہوتے ہیں۔تعلیمی نظریہ بھی دراصل حکمران طبقے کی ایک چھوٹی سی اقلیت ہی کا نظریہ ہوتا ہے۔جس کا سہارا لے کر وہ اپنی حکمرانی کو مستحکم کرتا ہے۔ انسانی تاریخ میں اب تک تعلیم کی تین قسمیں آزمائی جا چکی ہیں جن کا تعلق بنیادی طور پر تین سیاسی نظاموں سے ہے چونکہ سیاست معیشت سے ہٹ کر اپنا الگ وجود نہیں رکھتی اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ تین معاشی نظاموں نے تین قسم کی تعلیم کو متعارف کروایا۔

Sanjh Lok Raj

تعلیم بطور زیور

زرعی معیشت کے دور میں سیاسی نظام چونکہ جاگیرداری تھا جس کو ہم بادشاہت کے نام سے پہنچانتے ہیں۔ بادشاہوں کا مقصد اقتدار کی برقراری تھا اور رعایا کی زندگی کا مقصد بادشاہ کی خدمت واطاعت گزاری۔تعلیم اس زمانے میں کسی فرد کی انفرادی اور اضافی خوبی ہوتی تھی اور تعلیم کا براہ راست کوئی تعلق کاروبار زندگی سے نہیں تھا۔ اس لیے بادشاہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ ہر زمانہ میں انفرادی طور پر ایسے مفکر اور دانشور پیدا ہوئے جنہوں نے اپنے میلان طبع کے مطابق علم کے کسی نہ کسی شعبہ میں گراں قدر تخلیقی اضافہ کیا۔مختلف مقصدی علوم پر تحقیقی کام کیے گئے۔ تاہم یہ رجحان عام تھا کہ علم معمولی مقاصد حیات سے بالاتر ہے۔ اس وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ تعلیم کو کسی خاص مقصد کا پابند نہیں ہونا چاہیے کیونکہ علم کا مقصد صرف حقائق کا انکشاف ہے یا ابدی حقیقتوں کی تلاش ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں ایک بہت بڑی تعداد میں فلسفی، صوفی، مفکر اور دانشور موجود تھے جنھوں نے اپنی پوری زندگی غور وفکر میں صرف کردی۔ اس غور وفکر کا میدان انسانی زندگی سے ہٹ کر محض نظریاتی اور تصوراتی دنیا تک محدود تھا۔ تب علم بھی ایک محدود طبقہ کی اجارہ داری میں رہا اور محض فکری مشق کے طور پر جاری رہا۔ 18 ویں صدی تک علوم کا زیادہ تر حصہ ادب، شعر وسخن، داستان، ناول اور ڈرامہ تھا۔مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ فلسفہ طب اور سائنس ناپید تھے۔

زرعی دور میں تعلیم کو زیور سمجھا جاتا تھا اور بچوں کو تعلیم کے زیور سے آرستہ کیا جاتا تھا یہ تعلیم بچوں کے اخلاق سنوارنے۔ ان میں خوداعتمادی پیدا کرنے۔ کردار میں پختگی کی مشق کروانے۔ ادب و آداب سکھانے۔ وسیع القلبی کا عادی بنانے اور خود شناسی کے عمل سے گزارنے پر مشتمل تھی۔ اخلاق کو مذہب ہی کا لازمی حصہ سمجھا جاتا تھا اور بچوں کو اخلاقی تربیت کے لئے مذہب کی تعلیم دی جاتی تھی۔ ہندو پاٹھ شالاؤں میں اور مسلمان مدرسوں میں اخلاق کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ ہر مذہب اخلاق کی اپنی تعلیم کو مابعدالطبیعات کے ہر دعوے کی طرح ابدی اور غیر متبدل سمجھتا تھا۔ بادشاہ کا خدا سایہ ہونے یا دیوتاؤں کی اولاد ہونے کی تصدیق مذہبی پیشوا کیا کرتے تھے اس لیے بادشاہت اور پیشوائیت کا چولی دامن کا ساتھ تھا۔

Sanjh Lok Raj

بادشاہ صرف جبر و استبداد کا سہارا لے کر اپنی حکمرانی کو قائم نہیں رکھتا تھا بلکہ بادشاہ کی اطاعت مذہبی فریضہ ہوا کرتا تھا۔

یہ ساری تعلیم استاد مرکوز تعلیم تھی۔ سمجھا یہ جاتا تھا کہ استاد اپنی ذاتی کوشش ذہانت، شوق تجربے اور مطالعے سے جو حاصل کرتا تھا۔ وہ طالب علموں کو منتقل کر دیتا۔ سارا علم خبری تھا۔ مابعدالطبیعاتی علم کی طرح خبری علم بھی بے جان ہوتا ہے۔ زرعی دور میں تعلیم کو سماجی خدمت سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے ایسے علم کو زیور قرار دیا جاتا تھا۔ آج بھی آپ سکولوں کی چار دیواری پر ایسے اقوال لکھے ہوئے پڑھتے ہیں کہ علم ایک زیور ہے جسے کوئی چور چوری نہیں کر سکتا۔

2۔ تعلیم برائے معاشی ترقی و تحفظ سرمایہ دارانہ جمہوریت

تعلیم کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر یورپ میں صنعتی انقلاب کے دوران ظہور میں آیا۔ صنعت نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کی افادیت کو بڑھا دیا اور تعلیم کو پیداواری عمل کا حصہ بنا دیا۔ اس دوران معیشت اور تجارت سے متعلقہ علوم نے بھی بے پناہ ترقی کی۔ اب زراعت بھی موسم کے رحم و کرم پر نہیں رہی۔ زرعی ٹیکنالوجی، کیمیائی کھادیں اور پیداوار بڑھانے کے لیے مصنوعی بیج سے متعلقہ علوم نے سائنس کا درجہ حاصل کر لیا اور زرعی صنعت وجود میں آئی۔ طب اب میڈیکل سائنس بن گئی۔ جس سے میڈیکل ٹیکنالوجی اور فارمیسی نے دنیا کی منڈیوں کا رخ کیا۔ آمدورفت میں سائیکل سے لے کر بحری جہاز تک کی صنعتیں قائم ہونا شروع ہوگئیں۔ یہاں تک کہ فلم اور میڈیا بھی ایک انڈسٹری بن گئی۔ صنعتی دور میں سائنسی علوم نے سرمایہ داری کو عروج دیا تو سرمایہ داری نے سائنسی علوم کو انتہا تک پہنچایا۔

صنعتی معیشت کے نتیجے میں پیدا ہونے والے سیاسی نظام سرمایہ دارانہ جمہوریت کے عملی نفاذ اور اداروں کی تشکیل نے سماجی علوم کی افادیت کو بڑھا دیا۔ کچھ نئے سماجی علوم بھی پیدا ہوئے۔ فرد کے حقوق تعلیم، صحت، آبادی کنٹرول، فوج، قانون، عدالتیں یہاں تک کہ ماحول کو صاف ستھرا رکھنا۔ زندگی کا ہر شعبہ ایک نئے علم کا متقاضی تھا۔ اس طرح سماجی علوم کو بھی بڑھاوا ملا۔ اب تعلیم زیور نہیں رہی بلکہ تعلیم کا افادی پہلو سامنے آنے لگا۔
جس کا مطلب تھا کہ فکر و ادراک کی تربیت زندگی سے بے تعلق نہیں ہونی چاہیے۔

Sanjh Lok Raj

1789ء کے فرانسیسی انقلاب کے بعد سے جمہوریت کا موجودہ دور شروع ہوا۔ جمہوری زندگی کی سب سے اہم قدر فرد کا احترام ہے۔ اس کی رو سے ہر فرد کو اس بات کا پیدائشی حق حاصل ہے کہ وہ مظاہر فطرت اور قدرت کے خزانوں سے فائدہ اُٹھائے لیکن یہ اس وقت ممکن ہے۔ جب فرد کی صلاحیتیں پوری طرح بیدار ہو سکیں۔ ماہرین نفسیات اور تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ ہر فرد میں بہت سی صلاحیتیں ہیں۔ انسان توانائیوں کا سر چشمہ ہے۔ لیکن کوئی فرد پوری طرح اپنی صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوتا یہ کام صرف تعلیم کا ہے۔

صنعت نے جہاں سرمایہ دار طبقہ کی ایک چھوٹی سے اقلیت کو پیدا کیا وہاں ایک بہت بڑی اکثریت میں مزدور اور محنت کش طبقے کو بھی جنم دیا اس طرح معاشرے کی طبقاتی تقسیم بڑی واضح اور منظّم ہوگئی سرمایہ دار یہ چاہتے تھے کہ عوام کی مساوات کا دائرہ صرف سیاسی معنوں تک محدود رہے اور مزدور سرمایہ داروں کی حکومت کو اپنی حکومت مانتے رہیں۔

معاشیات کے علم نے سرمایہ داری کو قابو میں رکھنے کا مزید امکان پیدا کیا اور اقتصادی منصوبہ بندی کی پیش قیاسی میں مدد دی۔ اونچے معیار کی تجارت کے زبردست فروغ۔ بڑے پیمانے کی کارپوریشنوں، اجارہ داریوں اور قیمتوں کی اونچی سطح پر رکھنے والی سرمایہ دار یونینوں نے اک نسبتاً محدود طبقے کے ہاتھ میں زبردست اقتصادی طاقت مرکوز کر دی۔ اس کے ساتھ ہی سرمایہ دارنہ نظام اپنے نقطہ عروج پر پہنچ گیا۔ پھر یہ ہوا کہ آزادانہ مہم جوئی (Free Enterprise) کے باعث یہ نظام خود اپنی پیچیدگیوں کو حل کرنے سے قاصر رہا اور نتیجے میں نہ صرف عام بیروزگاری بلکہ کثیر اور وافر پیداوار کے پہلو بہ پہلو عوامی غربت و افلاس کا مسئلہ بھی پیدا ہو گیا۔

اس طبقاتی صورتحال کو ابراہم لنکن نے بڑے خوبصورت الفاظ میں بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ''تاریخ عالم کے ہر دور میں ایسا ہوا ہے کہ کچھ لوگوں نے مشقت کی اور دوسروں نے بغیر مشقت اس کے ثمرات سے فائدہ اُٹھایا۔ یہ نامناسب بات ہے اور یہ سلسلہ جاری نہیں رہنا چاہیے۔ کسی بھی اچھی حکومت کا یہ مقصد ہونا چاہیے کہ مزدور جو اپنی جسمانی اور ذہنی محنت سے کرہ ارض پر موجود زندگی کو سنبھالے ہوئے ہے وہ اپنی محنت کا پورا صلہ پائے۔''

اس میں شک نہیں کہ یورپ کے مالدار طبقے کے لوگ جو زیادہ تر پیدا کار اور صنعت کار تھے تعلیم کی اشاعت کے حامی تھے کہ صنعت کے فروغ کے لیے حقیقی خواندگی اور تکنیکی تعلیم

Sanjh Lok Raj

ضروری ہے۔لیکن اس زمانے میں محنت کش طبقہ بذات خود کوئی منظّم سیاسی طاقت نہیں تھا اور خود اپنی تعلیم کے بارے میں حیرت انگیز حد تک خاموش تھا۔ایک مدت تک ''نچلے طبقوں'' کی تعلیم کا فیصلہ ذی اقتدار لوگ کرتے تھے۔

لیکن آہستہ آہستہ محنت کش طبقے کو سرمایہ دارنہ جمہوریت کے پوشیدہ مقاصد سمجھ میں آنے لگ گئے۔چھوٹی سی اقلیت کثیر لوگوں کی محنت کا منافع اپنی جیب میں ڈالنے کے لیے آزاد تھی اور بہت سے خاندانوں کی اکثریت ایسی آمدنیوں پر منحصر تھی جو معمولی ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے مشکل سے کافی ہوتی تھی۔انسانی مساوات کا دائرہ صرف ووٹ ڈالنے تک تھا جبکہ زندگی کے تمام شعبے سنگین عدم مساوات کا شکار تھے انہوں نے زندگی کے تجربے سے سیکھ لیا تھا کہ سرمایہ داری نظام کا مطلب ہے کہ چھوٹی سی اقلیت کو امیر ترین رکھنے کے لیے بھاری اکثریت کو غریب رکھا جائے۔اور جمہوریت کے نام پر لوگوں کو اپنا استحصال کرنے والے ایک گروہ یا دوسرے کو اپنا حاکم بنانے کی آزادی ہو۔تعلیمی سماجیات کے ماہر اے۔سی۔کے اوٹاوے نے برطانوی پارلیمنٹ میں ہونے والے تقریروں کے ذریعے محنت کش طبقے کی تعلیم کے متعلق حکمران طبقے کے خیالات کو پیش کیا ہے۔''غریبوں اور محنت کشوں کو تعلیم دینے کا مقصد ایک نظریئے کی حیثیت سے خواہ کتنا ہی خوش نما ہو۔ان کے اخلاق اور نشاط دونوں کے لیے تباہ کن ہوگا۔کاشت کاری اور دوسرے مشقت طلب پیشوں میں ان کی کارکردگی کو بہتر بنانے کی بجائے وہ ان کو اپنی دنیوی حالت سے نفرت کرنا سکھائے گا۔اس کی بدولت ان میں باغیانہ پمفلٹ،شر انگیز کتابیں اور عیسائیت کے خلاف مطبوعات پڑھنے کی لیاقت پیدا ہوگی۔وہ ان کے اندر اپنے آقاؤں کے خلاف گستاخانہ جذبات پیدا کرنے کا باعث ہوگا اور بہت جلد قانون ساز ادارے اپنی طاقت کے جابرانہ پنجے انکی طرف بڑھاتے ہوئے نظر آئیں گے۔''

وہ سماجی علوم جن کی غیر جانبداراری کو سائنسی علوم کی طرح مسلمہ ثابت کرنے پر زور لگایا جاتا تھا وہ بھی سرمایہ دارانہ جمہوریت کی خدمت کرتے ہوئے نظر آئے۔تاریخ ہی کو لیجیے تاریخ کا سرمایہ دارانہ نظریہ تھا کہ چند شخصیات تاریخ ساز ہوتی ہیں۔یہ شخصیت مافوق الفطرت طاقتیں رکھتی ہیں عام آدمی کچھ نہیں ہوتا۔چمن میں بڑی مشکل سے پیدا ہونے والے دیدہ ور

ہی تاریخ بناتے ہیں۔لیکن سائنس کی کچھ دریافتوں نے چند ایسے حقائق کو بے نقاب کیا جس سے ثابت ہو گیا کہ محنت کرنے والوں نے ہی انسان کو قدرت کا مالک بنایا ہے۔ عام انسان ہی تاریخ بناتے ہیں۔ اس طرح 1989ء میں دنیا سے ہمیشہ ہمیشہ سے بادشاہت کے خاتمہ کرنے میں پہل کرنے والوں نے 1871ء میں ''پیرس کمیون'' برپا کر دیا۔ دنیا کی تاریخ کو نیا موڑ دیا۔ ان کا مطالبہ تھا کہ اجتماعی انسانی محنت سے کی گئی پیداوار سے حاصل کیا گیا منافع کو اجتماعی فلاح و بہبود پر خرچ ہونا چاہیے۔اس سے تعلیم کی ایک تیسری قسم نے جنم لیا۔

صنعتی دور نے جس تعلیم کو فروغ دیا وہ تجربی علم تھا۔ یہ تجربی علم پیدواری عمل کے دوران پیدا ہوا اور پھر اس نے پیداواری صلاحیتوں میں اضافہ کیا۔علم کو مسائل کے حل کا آلہ سمجھا جانے لگا اس لیے یہ تعلیم مسائل کا حل مرکوز تعلیم تھی۔

3 تعلیم برائے اجتماعی فلاح و بہبود

سرمایہ داروں نے فرانس کا انقلاب جاگیرداروں کے تسلط کو ختم کرنے کے لیے برپا کیا تھا تاکہ سیاسی اقتدار حاصل کر کے اپنے معاشی مفاد کی پرورش کر سکیں۔ سرمایہ داری نے غیر محدود انفرادیت کی وجہ سے عروج حاصل کر لیا۔ جب کسی فرد کو غیر محدود طریقہ سے دولت سمیٹنے کے مواقع حاصل ہو جائیں تو وہ دوسروں کا استحصال بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے عوام کی حالت بدستور زبوں رہی۔ مارکس اور اینگلز نے اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھا کہ محنت کش عوام کی حالت اس وقت تک بہتر نہیں ہو سکتی جب تک وہ خود وسائل پیداوار پر قبضہ کر کے استحصال کا خاتمہ نہ کر دیں۔ لہٰذا فرانس ہی کے محنت کشوں نے جس طرح جاگیرداری کے خاتمے میں پہل کی۔ اسی طرح سرمایہ داری کے خاتمے میں بھی پہل کر کے 1871 میں پیرس پر قبضہ کر لیا جو 70 دن تک قائم رہا اور دنیا کے محنت کشوں کے لیے آئندہ کے انقلاب کے لیے راہ ہموار کی۔

روس، چین اور مشرقی یورپ کے کئی ممالک میں انقلابات برپا ہوئے اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر کے محنت کشوں نے وسائل پر خود قبضہ کر لیا۔ یہ سوشلسٹ انقلاب تھے۔

ان کا معاشی فلسفہ یہ تھا کہ زمین اور مشین جو وافر دولت پیدا کریں اس سے

Sanjh Lok Raj

اکثریت کو فائدہ پہنچے۔ افراد جو دولت کو پیدا کرتے ہیں ان کی لیاقتوں کی نا برابری کا خیال رکھتے ہوئے ان کی محنت کا پورا پورا صلہ دیا جائے تا کہ اس افراط کے ثمرات میں حصہ پانے کے وہ برابر حقدر ہوں۔ اس معاشی فلسفے سے جو سیاسی نظام پیدا ہوا اسے عوامی جمہوریت کہتے ہیں۔ یعنی 99.99 فیصد لوگوں کا راج۔ حکومت کا مطلب ہے حکم چلانا۔ جبکہ عوامی جمہوریت کا مطلب ہے کہ کاروبار زندگی چلانے میں عوام کی شرکت۔ اور یہ تبھی ممکن ہے کہ محنت کش طبقہ زندگی کے مختلف شعبوں میں منظّم ہو۔ عوامی جمہوریت نے نظام تعلیم کا جو عملی نمونہ پیش کیا اس کے مطابق علم زیادہ وسیع تر مفہوم میں ان حقائق اور نظریات پر مشتمل ہے جو ایک فرد کو کسی مظہر کو سمجھنے اور مسائل کو حل کرنے کے قابل بناتے ہیں۔ علم کا عملی پہلو اور کسی فرد کا اس پر عبور یہ ہے کہ وہ فرد اس علم کو کسی بھی صورت حال (مسئلے) کی تفہیم، مسئلے کی وضاحت، کنٹرول، پیش گوئی اور اس کے حل کے لیے استعمال کر سکتا ہو۔

سائنسی تعلیم کے ذریعے پیداواری صلاحیت کو بڑھاتا، ٹیکنالوجی کے نظر آنے والے امکانات کو ہر رنگ مشرب و نسل کے زیادہ سے زیادہ عوام کی صحت، فراغت اور تحفظ کے حصول میں استعمال کیا جائے۔

علم ساری دنیا کے انسانوں کی مشترکہ میراث ہے۔ سائنسی ایجادات سے عالم انسانیت کو مشترکہ فائدہ پہنچایا جائے۔ کم از کم رہائش، علاج، خوراک کی فراہمی ہر انسان کے لیے مفت ممکن ہو۔ تعلیم ہر انسان کا پیدائش حق ہے۔ دوران تعلیم طالب علم کے تعلیمی و زندگی گزارنے کے تمام تر اخراجات کی فراہمی ریاست کی ذمہ داری ہو۔

سماجی علوم جو سرمایہ داری کی خدمت کا فریضہ سرانجام دے رہے تھے ان کی تحقیق کو سائنسی بنیادوں پر استوار کر کے انھیں سماجی سائنس بنایا جائے تا کہ یہ انسان کے باعزت مقام اور اعلیٰ معیارِ زندگی کو حاصل کرنے میں مددگار ہو۔ سائنس کی طرح غیر جانبدار ہو۔ تب سے سماجی علوم کا رخ سماجی سائنس کی طرف ہوا۔

وہ علم جو مادی ترقی نہیں دے سکتا وہ روح کی نشو ونما کے لیے بھی بے کار ہوتا ہے۔

سوشلزم نے فرد کے اندر چھپی ہوئی خو دغرضی سے جنگ کی اس طرح اخلاق کا معیار انسان کی اجتماعی فلاح و بہبود ٹھہرا۔ اخلاق کو کسی ماورائی تعلیم کی بجائے انسانوں کے

Sanjh Lok Raj

فائدے یا نقصان سے جوڑا گیا۔ اب تک تین طرح کی رسمی تعلیم دنیا کے مختلف ممالک میں جاری رہیں۔ رسمی تعلیم ریاست پر قابض حکمران طبقے کی طرف سے نافذ کی گئی تعلیم ہوتی ہے۔ جو بادشاہت، جمہوریت اور سوشلسٹ نظاموں میں الگ الگ ہوتی ہے۔ اگر غیر ملکی قابض ہوں تو وہ اپنے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے تعلیم دیتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

تعلیم کا نو آبادیاتی ڈھانچہ

تعلیمی نظام سماجی ساخت کا آئینہ دار ہوتا ہے یہ ایک تھیوریٹیکل بات ہے۔ عملی طور پر کسی ملک کا تعلیمی نظام اس ملک کے سیاسی نظام ہی کا حصہ ہوتا ہے۔ حکمران طبقے کے سیاسی مفادات کے تحفظ کے لیے بنایا جاتا ہے۔ ہندوستان کے جغرافیائی خطے (جو آج پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش میں تقسیم ہو چکا ہے) میں تعلیم عامہ کا تصور پہلی مرتبہ برطانوی حکمرانوں نے متعارف کروایا۔ برطانوی حکمران غلام ہندوستانیوں کو تعلیم دے کر کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے کس قسم کا تعلیمی ڈھانچہ تشکیل دیا؟ اس تعلیمی ڈھانچے میں آزادی کے بعد کیا تبدیلیاں رونما ہوئیں؟ تعلیم کے مقاصد کیا ہو سکتے ہیں اور یہ کس طرح حاصل کیے جاتے ہیں اس کا تھوڑا سا اندازہ ہمیں تعلیم کی تاریخ سے ہو جائے گا۔

ہندوستان میں بادشاہت کے دور کا تعلیمی نظام اس کی سلطنت کی اشرافیہ کی ضرورتوں کے مطابق ہوا کرتا تھا۔ امراء کے لئے تعلیم ایک مشغلہ تھی۔ رعایا دستکاری سیکھنے ہی کو تعلیم سمجھتے تھے۔ زندگی اور کائنات دونوں کا محدود سا تصور تھا۔ کائنات اور اس وقت کے علم کے مطابق ایک جامد شے تھی جیسے صدیوں پرانا کوئی بنا بنایا گھر ہو۔ زمین کائنات کا مرکز تصور کی جاتی تھی۔ زمین پر رونما ہونے والے ہر واقعہ پر عالم بالا کی مرضی چلتی تھی۔ انسانوں سمیت کائنات کے اندر موجود ہر شے کا مستقبل پہلے سے طے شدہ تھا اور نا قابل تغیر بھی تھا۔ مذہبی پیشوا بادشاہوں کے فکری اور سیاسی محافظ تھے تعلیم مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں تھی۔ بادشاہ کی جاگیردار اشرافیہ اور مذہبی پیشوا ایک مقدس گٹھ جوڑ کے ذریعے بادشاہت کا سہارا بنے ہوئے تھے۔

جاگیرداری سماج میں مابعدالطبیعات کو تعلیم سمجھا جاتا تھا۔ یہ تعلیم شخصی تھی اور خاص لوگوں کے لیے تھی اس لیے یہ تاثر بنا دیا گیا کہ اعلیٰ دماغ ہی اعلیٰ مابعدالطبیعاتی علم کو سمجھ سکتے ہیں

Sanjh Lok Raj

دستکاری اور دستی فنون جن سے تمام لوگوں کا روزگار منسلک تھا اور جس نے آگے جا کر انجینئرنگ اور ٹیکنالوجی کی شکل اختیار کر لی تھی اسے گھٹیا لوگوں کا کام اور گھٹیا علم ظاہر کیا جاتا تھا۔ بادشاہ اور اس کی اشرافیہ چاہتی تھی کہ رعایا تقلید پسند ہو تاکہ ماضی کی عظیم الشان روایات کو زندہ رکھا جا سکے۔ بادشاہوں نے اگرچہ تعلیمی ادارے کھول کر لوگوں کو تعلیم دینے کی کوشش تو نہیں کی مگر وہ لوگوں کی انفرادی کوششوں سے پیدا کیے گئے علم سے غافل نہیں تھے۔ وہ ایسی تعلیم کا محاسبہ کرتے تھے جو آنے والے وقت میں ان کے سیاسی نظام کے لیے خطرہ بن سکتی ہو۔

یورپ میں صنعتی دور میں اقتدار جاگیردار اشرافیہ کے ہاتھوں سے نکل کر صنعت کار طبقے اور سرمایہ داری کی محافظ سیاسی پارٹیوں کے نمائندوں کو منتقل ہو گیا۔ انھیں نیچے تک حکمرانی بنانے کے لیے ریاستی ادارے اور ان کے ذیلی محکمے قائم کرنے پڑے۔ قانون و انصاف، تعلیم و روزگار، صحت و صفائی، ٹرانسپورٹ و مال برداری، زراعت و آبپاشی، صنعت و تجارت، زندگی کے ہر شعبہ کو محکموں کی شکل میں منظّم کرنا پڑا۔ بادشاہ کا اختیار اب کئی محکموں اور ان کو چلانے والوں میں تقسیم ہو گیا۔ معاشی ترقی کے لیے سائنس، ٹیکنالوجی اور معاشیات کے علوم کی افادیت بڑھی تو سیاسی نظام کے قیام۔ استحکام اور اداروں کے قیام کے لیے سماجی علوم سے رہنمائی حاصل کرنا پڑی۔ اور ان تمام علوم کو پیدا کرنے کے لیے تسخیر کائنات۔ تسخیر انسان اور تسخیر سماج کرنا تھی نئی نئی تحقیقات نے نئے نئے علوم کے دروازے کھولے یہاں تک کہ سماجی ترقی میں مذہب کا کردار بھی زیر بحث آنے لگا۔ اب تک انسان نے علم کے اتنے خزانے پیدا کر لیے کہ کوئی انسان اپنی ایک زندگی میں کسی ایک شعبہ علم پر بھی پوری دسترس حاصل نہیں کر سکتا۔ صنعتی معاشی نظام اور اس کے اوپری ڈھانچے سرمایہ دارانہ جمہوریت کو اپنی بقا اور استحکام کے لیے کسی ماورائی نظریئے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہ لوگوں کے متعلق لوگوں کے اپنے فیصلے ہوتے ہیں تبھی جمہوریت بھی ایک سیکیولر نظام حکومت ہے۔

ہندوستان میں بادشاہت کسی اندرونی تبدیلی کی وجہ سے ختم نہیں ہوئی بلکہ برطانوی سامراج کے قبضے کے نتیجے میں ختم ہوئی۔ غیر ملکی حکمرانوں کا تعلق ایک ترقی یافتہ صنعتی ملک سے تھا جب کہ ان کی ہندوستانی رعایا ابھی جاگیرداری پسماندہ سماج میں زندگی گزار رہی تھی۔

برطانوی حکومت نے غلام ہندوستانیوں کی تعلیم کی طرف اس وقت توجہ دی جب

Sanjh Lok Raj

برطانیہ خود تجارتی سرمایہ داری کے مرحلے سے نکل کر صنعتی سرمایہ داری کے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا۔ تجارتی سرمایہ داری کے دور میں ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنا کاروبار بڑھانے کے لیے لوگوں سے میل جول رکھنا پڑتا تھا اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کی تعلیمی سرگرمیاں زبانیں سیکھنے اور ان زبانوں کے ذریع مقامی لوگوں کے خیالات کو جاننے تک محدود تھیں۔ یہ سب کچھ وہ ذاتی حیثیت میں کرتے تھے۔

یورپ کی تجارتی کمپنیوں کی ہندوستان آمد سے پہلے تعلیم طبقہ امراء اور شہزادوں تک مخصوص تھی امیروں کے بچے گھر ہی میں پڑھا کرتے تھے جہاں ان کے تعلیم کے لیے قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ ہندو معاشرے میں اچھوت لوگوں کے لیے تعلیم ممنوع تھی۔ عام لوگوں کو تعلیم سے دور رکھ کر انہیں کند ذہن اور امیروں کے بچوں کو ذہین ثابت کرنے میں آسانی ہوتی تھی۔

عام لوگوں میں اگر کوئی تعلیم حاصل کرتا بھی تھا تو صرف مذہبی اداروں میں، عام مسلمان مدارس میں عام ہندو مندورں کی پاٹھ شالاؤں میں اور عام سکھ گورودواروں میں تعلیم حاصل کرتے تھے۔ یہ مذہبی تعلیمی ادارے امیر لوگوں کی خیرات اور صدقات سے چلائے جاتے تھے۔ عورتوں کی تعلیم کے بارے میں مولانا اشرف تھانوی فرماتے ہیں کہ اگر ''لکھنا'' سکھایا بھی جائے تو صرف اس قدر کہ وہ ضروری خط اور گھر کا حساب کتاب لکھ سکے بس اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں۔

کسی زمانے میں ہندوستان بدھ مت کی عظیم درسگاہوں کی وجہ سے پوری دنیا میں مشہور تھا۔ لیکن یورپیوں کی آمد تک یہ درسگاہیں زمین کی تہوں میں دفن ہو چکی تھیں۔ صرف بدھ مت ہی کیا دنیا کے تمام مذاہب اپنے اپنے وقت کی تعلیم مانے جاتے تھے۔ ہر مذہب نے اپنے اپنے مطابق تخلیق کائنات اور تخلیق انسان کے عقائد متعارف کروار کھے تھے۔ کچھ تاریخ، کچھ عبادات اور سب سے بڑھ کر ہر مذہب کا اخلاقی نظام۔ بادشاہت کے دور میں اتنی تعلیم ہی بہت بڑی تعلیم تھی۔ مذہبی تعلیم کے علاوہ تعلیم کی اپنی الگ شناخت موجود نہیں تھی۔

فرانس کی تجارتی کمپنی نے پانڈی چاری میں اور پرتگالی تجارتی کمپنی نے گوا میں جنوبی ایشیا کے ابتدائی تعلیمی ادارے قائم کیے، مگر یہ ادارے عیسائی مبلغین نے بنائے تھے۔ کسی

Sanjh Lok Raj

بھی مذہب کا پیروکار سب متبادل عقائد کو پہلے ہی سے غلط مان کر صرف اور صرف اپنے مذہب کو دنیا کی قطعی اور آخر سچائی سمجھتا ہے۔ اور اپنے ارد گرد کے بھٹکے ہوئے گمراہ لوگوں کو راہ راست پر لانا اپنا اوّلین فرض سمجھتا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ہی کی وجہ سے ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ کی ابتدا ہوتی۔

1698ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک ایکٹ کے ذریعے ہندوستان میں موجود یورپی باشندوں کی تعلیم کے بارے میں سوچ بچار شروع کی۔

1757ء میں برطانوی ایسٹ انڈیا کمپنی نے بنگال۔ بہار اور اڑیسہ پر قبضہ کر لیا تو برٹش انڈیا میں ایک قانون کے ذریعے عیسائی مبلغین کے لیے آزادی سے کام کرنے میں آسانیاں پیدا کی گئیں۔ اس لیے ہندوستان کے مقامی باشندے (ان کا تعلق کسی بھی مذہب سے تھا) ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے تعلیم کے متعلق کی جانے والی ہر کوشش کو عیسائیت کی تبلیغ سمجھتے تھے۔ عیسائیت کے پھیلاؤ کو اپنے اپنے مذہب کے لیے خطرہ سمجھتے تھے۔ انہیں یہ بھی خدشہ تھا کہ برطانوی کمپنی انھیں عیسائی بنا کر اپنے خلاف بغاوت کے خطرے کو کم کرنے میں مدد حاصل کرنا چاہتی ہے۔ لیکن وقت نے ثابت کیا کہ برطانوی تجارتی کمپنی کی ترجیحات مذہبی سے زیادہ معاشی تھیں۔

1781ء میں لارڈ وارن ہیسٹنگ نے کلکتہ میں ایک مدرسہ قائم کیا جس کا ذریعہ تعلیم عربی تھا۔

1791ء میں جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت سکول کھولا۔

1797ء میں چارلز گرانٹ نے ایک مقالہ لکھا (Observation on the state of society) اپنے ملک کی صنعتی ترقی اور اپنی مصنوعات کی کھپت کے لیے تعلیم کی اہمیت بیان کی اور ہندوستان کے لوگوں کو انگریزی تعلیم دے کر ان کے ذہن کو برطانیہ کی اشیاء خریدنے پر آمادہ کرنے کا عندیہ دیا۔ چارلز گرانٹ کو جدید ہندوستان کا بابائے تعلیم کہا جاتا ہے۔ 1790ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر چارلز گرانٹ وطن واپس چلا گیا تھا وہاں اس نے اخبارات کے ذریعے اور برطانوی پارلیمنٹ میں تقریریں کر کے برطانوی حکومت کی ہندوستانیوں کو تعلیم سے آراستہ کرنے کی طرف توجہ مبذول کروائی۔ یہاں تک کہ اس کی کوششوں سے 1813ء کا چارٹر ایکٹ منظور ہوا۔

Sanjh Lok Raj

1800ء میں لارڈ ویلسلے نے کلکتہ میں فورٹ ولیم کالج بنایا۔ اسی کالج کے پرنسپل جان گلکرائسٹ نے اردو زبان کی پہلی ڈکشنری اور گرامر مرتب کی۔

1806ء اسی ادارے کو بنگالی زبان کی ترویج و ترقی کے لیے مخصوص کر دیا گیا۔

انگلستان میں اب صنعتی سرمایہ داروں کا دور دورہ تھا۔ سماجی قدریں اور نظریئے بھی اب اس بدلتے ہوئے پیداواری نظام کے ساتھ تبدیل ہو رہے تھے۔ حکومت کی کارکردگی اور بیرونی دنیا کے ساتھ تعلقات بھی اُبھرتے ہوئے صنعتی سرمایہ دار طبقے کے مفادات اور سوچ کے زیر اثر آ رہے تھے۔ لہٰذا اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ برطانوی پارلیمنٹ میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی کارکردگی پر بھی نکتہ چینی ہونے لگی۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں تھا کہ آخر کار انگریزوں کو ہندوستان کے ساتھ کیے جانے والے ظلم کا احساس ہو گیا تھا اور وہ اپنے گناہوں کی تلافی چاہتے تھے۔ تاجروں اور کمپنی پر کی جانے والی یلغار کا مقصد صرف اتنا تھا کہ مقبوضہ ہندوستان میں نافذ پالیسیوں کو اب انگلستان کے بدلتے ہوئے حالات سے ہم آہنگ کیا جائے۔ اس ضمن میں 1813ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی اجارہ داری ختم کر دی گئی اب کوئی بھی برطانوی کمپنی ہندوستان میں تجارت کر سکتی تھی اس کے ساتھ ہی ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمہ داری بھی ایسٹ انڈیا کمپنی پر ڈال دی گئی۔ کیونکہ ہندوستان پر حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کر رہی تھی۔ برطانوی پارلیمنٹ اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈائریکٹروں کے درمیان یہ بحث جاری رہی کہ:

مقامی تعلیم ہی کو رائج کیا جائے یا مغربی تعلیم کو؟

تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہو یا نجی؟

تعلیم ایک خاص طبقے تک محدود ہو یا عوام الناس کے لیے؟

کس زبان کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے؟

مقامی نظم ونسق کو کامیابی سے چلانے کے لیے، کس تعلیم کے ذریعے مقامی لوگوں کو سرکاری ملازمت کے قابل بنایا جائے؟

1813ء میں برطانوی پارلیمنٹ نے ہندوستانیوں کی تعلیم کی ذمہ داری چارٹر ایکٹ کے ذریعے ایسٹ انڈیا کمپنی پر ڈال دی اور ہدایت کی کہ ایسٹ انڈیا کمپنی عربی اور فارسی کے علاوہ سنسکرت کے ساتھ ساتھ مغربی لٹریچر اور سائنس کی ترویج کرے۔ عیسائی مشنری تنظیموں کو

Sanjh Lok Raj

ہندوستان میں کام کرنے کی مکمل آزادی ہو مغربی تعلیم کے لیے ذریعہ تعلیم انگریزی ہو۔

1823ء تک اس قانون پر کوئی عملدار آمد نہ ہو سکا۔ بعد ازاں اس سلسلہ میں ایک جنرل کمیٹی فار پبلک انسٹرکشن قائم کر دی گئی تا کہ وہ فیصلہ کرے کہ اس قانون پر کس طرح عملدر آمد کرنا ہے۔ اس کمیٹی کا سربراہ لارڈ میکالے کو مقرر کیا گیا۔ اس کمیٹی میں دو طرح کی رائے رکھنے والے لوگ موجود تھے۔ ایک گروپ کا خیال تھا کہ مقبوضہ ہندوستان میں عربی، فارسی اور سنسکرت کو تعلیم کا ذریعہ رکھ کر ان زبانوں میں موجود علم کی ترویج کی جائے۔ دوسرا گروپ یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان میں انگریزی زبان رائج کر کے اس کے ذریعے مغربی فلسفہ اور سائنس کی ترویج کی جائے۔

1927ء میں بورڈ آف ڈائریکٹرز نے اعلان کیا کہ ہمیں فی الحال ایسے طبقے کی تیاری کی پوری کوشش کرنی چاہیے۔ جو ہمارے اور ان کئی ملین لوگوں کے مابین رابطے کا سبب بن سکے جن پر ہم حکومت کرتے ہیں۔ یہ افراد کی ایسی جماعت ہوگئی جو رنگ اور خون کے حساب سے ہندوستانی ہو گی لیکن مزاج، رجحانات، اخلاق اور ذہن انگریزی ہو گا۔ یہ بات اس طبقہ پر منحصر ہے کہ اپنے ملک کی مقامی بولیوں کو ستھرا بنائیں اور سائنسی کی اصلاحات مغربی علوم سے حاصل کر کے اپنی زبانوں کو مالا مال کریں۔ پھر بتدریج عوام تک علم کی ترسیل کا اسے ذریعہ بنائیں۔

صنعتی سرمایہ داروں کا مفاد اس میں تھا کہ اپنی مصنوعات کے لیے بیرونی منڈیوں پر قبضہ کیا جائے اور بیرونی ممالک سے سستا خام مال حاصل کیا جائے۔ ان مقاصد کے لیے ہندوستان میں زراعت کا ایک ڈھانچہ تعمیر کیا گیا۔ جس میں نہروں کا جال بچھا کر زمینوں کو آب پاشی کے قابل بنایا گیا۔ ہندوستان کو زراعت پر جامد کرنے کے لیے جاگیردار طبقہ پیدا کیا گیا اور انھیں سیاسی طاقت بنا کر اقتدا میں شامل کیا گیا۔ ہندوستانی کی دستکاری کو برباد کرنے کے لیے اور برطانوی سوتی مصنوعات کو تحفظ دینے کے لیے ہندوستانی چھیٹ پر 78 فیصد درآمدی ڈیوٹی لگا دی اور ہندوستانی مصنوعات پر پابندی لگا دی گئی انگریز صنعت کاروں نے نہایت تیزی کے ساتھ ہندوستان کی منڈی میں اپنے قدم جمائے اور 1835ء تک برطانیہ کے سوتی کپڑے کی کل پیداوار کا ایک چوتھائی ہندوستان میں بکنے لگا۔ جس سے ہزاروں جولاہے بے روزگار ہو

Sanjh Lok Raj

گئے اور بنگال میں قحط کی صورت حال پیدا ہوگئی۔ انگریزوں نے ہندوستان کی پھلتی پھولتی کپڑے کی صنعت کو تباہ و برباد کر کے ایک طرف تو مشین سے پیدا کی ہوئی اپنی مصنوعات کے لیے وسیع منڈی بنائی تو دوسری طرف اپنی ملوں کے لیے سستی خام کپاس حاصل کی۔ انگریزوں نے 1793ء کے مستقل آبادکاری ایکٹ (Permanent Settlement) کے ذریعہ زمینداروں کا جو نیا طبقہ پیدا کیا۔ وہ بین الاقوامی تقسیم محنت میں ہندوستان کو برطانیہ کا زراعتی دم چھلہ بنانے میں نہایت کارآمد ثابت ہوا۔

1835ء فروری میں تعلیم کے لیے بنائی گئی جنرل کمیٹی فار پبلک انسٹرکشن کا اجلاس ہوا اور کمیٹی کے سربراہ نے کمیٹی کے سامنے جو تقریر کی وہی اس کی تعلیمی پالیسی ہے۔ اس کو ایک ریزولیشن کی شکل میں 7 مارچ 1935ء کو منظور کیا گیا۔ اس کو (Bentincks Resolution) کہتے ہیں۔ میکالے کی تقریر کا ایک اقتباس یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

''مجھے پتہ ہے کہ کمیٹی کے آدھے ارکان غلام ہندوستانیوں کے لیے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے اور مغربی تعلیم کی ترویج کے حق میں ہیں جب کہ باقی آدھے مقامی زبانوں کی ترویج میں دلچسپی رکھتے ہیں۔ میں نے عربی، فارسی اور سنسکرت کی اہم کتابوں کے تراجم کا مطالعہ کیا ہے۔ میں نے ان زبانوں کے ماہرین سے گفتگو بھی کی ہے اور میں نے کوئی ایسا مستشرق بھی نہیں دیکھا جو اس بات سے انکار کرے کہ یورپی علم و ادب کی کتابوں کی ایک چھوٹی سی الماری عربی اور سنسکرت کے پورے علم پر بھاری ہے۔ مشرق کا کل علم زیادہ سے زیادہ شاعری ہے۔ مغربی علوم کی مشرقی لٹریچر پر برتری پوری کمیٹی نے مان لی ہوئی ہے۔ اس پر اضافہ یہ کہ مغربی شاعری بھی مشرقی شاعری پر بھاری ہے۔ تمام لوگ جانتے ہیں کہ مقامی زبانوں میں نہ تو کوئی قابل ذکر ادبی تحقیق ہے اور نہ ہی سائنسی معلومات کا کوئی ذخیرہ۔ مزید برآں مقامی زبانیں اتنی کمزور اور بیرونی اثرات قبول کرنے میں مزاحم ہیں کہ ان میں علمی ترقی ممکن نہیں تاوقتیکہ ان میں دوسری زبانوں میں موجود علم شامل نہ کیا جائے۔

ہمیں ان لوگوں کو تعلیم دینی ہے جنہیں ان کی مادری زبان تعلیم دینے کے اہل نہیں۔ یہاں پر ایسی معلومات کو تعلیم کہا جاتا ہے جنہیں پڑھ کر ہمارے سکولوں کے بچے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو جائیں یہاں کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یورپ کے پرائمری سکول کی تعلیم کے معیار کے

Sanjh Lok Raj

برابر ہے۔

کمیٹی کے ارکان کیا چاہتے ہیں کہ انہیں ایسا علم فلکیات پڑھایا جائے جسے بچے بھی مذاق سمجھیں۔ کیا انھیں ایسی تاریخ پڑھائی جائے جس میں تیس تیس فٹ کے قد آور بادشاہوں نے تین تین ہزار سال حکومت کی ہو۔ کیا انہیں ایسا جغرافیہ پڑھایا جائے جن میں مکھن کے سمندر کا ذکر ہو۔

اب تک ہم ایسی کتابیں چھاپ رہے ہیں جن میں استعمال ہونے والے کاغذ کی قیمت ان میں موجود معلومات سے زیادہ ہے۔ عربی، فارسی اور سنسکرت میں تعلیم حاصل کرنے والے طلباء ایسی تعلیم حاصل کر رہے ہیں جو ان کی زندگی کو لوگوں کی خیرات پر زندہ رہنا سکھاتی ہے۔''

☆ 1835ء ہی میں نئی سرکاری پالیسی کے اعلان کے بعد تعلیم عامہ کمیٹی نے 48 سکول کھولے۔

☆ 1836ء میں نئی طرز پر ہگلی کالج کلکتہ اور میڈیکل کالج بنایا گیا۔

☆ 1840ء میں ہر ضلعی مقام پر سکول کھولنے کی پالیسی کے تحت سکولوں کی تعداد 40 ہوگئی۔

☆ 1844ء میں لارڈ ہرڈنگ نے اعلان کر دیا کہ سرکاری نوکری صرف سرکاری سکولوں میں پڑھنے والوں کو ملے گی۔ ہندو کالج کلکتہ میں انجینئرنگ کی کلاسیں شروع کر دی گئی۔

☆ 1847ء میں انجینئرنگ کالج رڑکی کا قیام عمل میں لایا گیا۔

تعلیم کی ان تمام کوششوں کے باوجود بہت ہی کم لوگ ایسے ملے جنھیں علمی دلچسپیوں کی طرف مائل کیا جا سکتا تھا کیونکہ ہندوؤں میں علم کی اجارہ داری برہمنوں کے پاس تھی جو ایک بہت چھوٹی سی اقلیت تھے اور مسلمانوں کی آبادی کا بہت بڑا حصہ جاگیرداری کے اثر میں تھا۔ جس کی رعایا کو صرف زراعت اور سپاہی بھرتی ہونے تک کی اجازت تھی۔ 1854ء میں برطانوی پارلیمنٹ کے زیرنگرانی انکوائری ہوئی اور تعلیم کے لیے نئی سفارشات مرتب کی گئیں۔ مغربی علوم کی افادیت اور مشرقی علوم کی نئے تقاضوں سے عدم مطابقت کو تسلیم کیا گیا۔ تعلیمی نظام میں تبدیلیوں کی سفارشات کو وڈز ڈسپیچ کی شکل میں ہندوستانی نظام تعلیم کا حصہ بنایا گیا۔

ڈسپیچ کی سفارشات کے مطابق:

☆ ہر صوبے میں محکمہ تعلیم قائم کیا جائے۔ ڈائریکٹر آف پبلک انسٹرکشن اس محکمے کا سربراہ ہو۔

☆ کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے صدر مقامات پر یونیورسٹیاں قائم کی جائیں۔

☆ (Downward filtration) ناکام ہو چکی ہے جو روپیہ اعلیٰ طبقے کو تعلیم دینے کے لیے خرچ کیا وہ بے کار ہو گیا۔ عامتہ الناس کی تعلیم پر زور دیا جائے۔

☆ نجی کوششوں سے قائم کیے جانے والے تعلیمی اداروں کو گرانٹ دی جائے۔

☆ اساتذہ کی ٹریننگ کے لیے سکول قائم کیے جائیں۔

☆ قانون، انجینئرنگ اور میڈیکل کے شعبوں کی تعلیم کا اہتمام کیا جائے۔

☆ عورتوں کی تعلیم کو یکساں اہمیت دی جائے۔

1857ء میں انگریزوں کے خلاف آخری لڑائی لڑی گئی جو باقاعدہ اور منظّم نہ تھی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کا پورے ملک ہندوستان پر قبضہ ہو گیا اور ملک ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر براہ راست تاج برطانیہ کے قبضے میں چلا گیا۔ اب بھی یہ فیصلہ برطانوی حکمران ہی کرتے تھے کہ غلام ہندوستانیوں کو کس قسم کی تعلیم دینی ہے؟ ذریعہ تعلیم کیا ہو؟ طریقہ تدریس کیسا ہو؟ وغیرہ۔

1868ء میں زمین کے لگان پر ایک فیصد تعلیمی ٹیکس عائد کیا گیا تاکہ بہتر کارکردگی دکھانے والے سکولوں کو گرانٹ دی جائے۔

1882ء میں وڈ کی سفارشات پر عملدرآمد نہ ہونے کی وجہ سے ایک انڈین ایجوکیشن کمیشن قائم کیا گیا۔ سر ولیم ہنٹر اس کمیشن کے سربراہ تھے۔ اس کمیشن میں پہلی مرتبہ ہندوستانیوں کو بھی نمائندگی دی گئی۔ کمیشن تعلیم کے معاملے میں نجی اداروں کی حوصلہ افزائی کا حامی تھا۔ کمیشن نے ہندوستانی زبانوں کو پرائمری اور سیکنڈری ایجوکیشن میں ذریعہ تدریس کے طور پر استعمال کرنے کی سفارش کی لیکن عملاً اسے نافذ نہیں کیا۔

صنعتی انقلاب کے بعد یورپ میں تعلیم پیداواری عمل کا حصہ بن چکی تھی۔ اس لیے نئی نئی ایجادات کی راہیں کھل رہی تھیں اور ان ایجادات کو بڑے پیمانے پر صنعتی پیداوار میں

تبدیل کرنے کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم میں اضافہ ہو رہا تھا۔ یورپی ممالک میں سرمایہ دارانہ جمہوریت کے اداروں کے قیام اور سیاسی نظام کے استحکام کے لیے سماجی علوم پر تحقیق جاری تھی اور ان علوم کی تعداد اور تحقیقی معیار میں اضافہ ہو رہا تھا اس طرح یورپ کا تعلیمی نظام پیداواری اور مسائل کا حل مرکوز تعلیمی نظام تھا۔ جبکہ ہندوستان میں انگریزوں کو ایسی تعلیم کی ضرورت تھی جو صرف حرف شناسی تک محدود ہو۔

انگریزوں کی صنعتی پیداوار کی ہندوستانی آبادی میں کھپت کے لیے راہ ہموار کرے۔ سیاسی بیداری پیدا نہ ہونے دے۔ برطانوی راج کے معاشی مفادات کی اندون ملک اور بیرون ملک حفاظت کرے۔ کروڑوں کی آبادی کو برٹش راج کے چندسو انگریزوں کے انتظامی طور پر کنٹرول میں رکھنے میں مددگار ہو۔ اس لیے اس تعلیمی نظام کو غیر پیداواری تعلیمی نظام کہتے ہیں۔

انیسویں صدی کے آخر تک انگلستان میں بنکوں اور بیمہ کمپنیوں نے بہت سا نقد روپیہ اکٹھا کر لیا ہوا تھا اور مالیاتی سرمایہ میں اپنی اجارہ داری قائم کر لی ہوئی تھی۔ اپنے ملک میں سرمایہ پر منافع کی شرح گھٹ جانے کے رجحان کو دیکھتے ہوئے برطانوی مالیاتی سرمایہ دار اب بیرونی ممالک میں سرمایہ لگا رہے تھے۔ ہندوستان اب صرف منڈی ہی نہیں رہ گیا تھا۔ ریلوے کا قیام۔ نہروں کا جال اور مشرق بعید میں برطانیہ کی پھیلتی ہوئی منڈی کو آسانی سے سستا مال فراہم کرنے کے لیے یہ نہایت موزوں تھا کہ ہندوستان کے سستے خام مال کو ہندوستان کی سستی محنت کے ذریعے مصنوعات میں تبدیل کر کے قریب کی منڈیوں میں فروخت کیا جائے۔ اس لیے بمبئی، جمشید پور اور دیگر شہروں میں کارخانے لگے۔ ہندوستان میں برطانوی مالیاتی سرمایہ لگنے اور آبپاشی اور آمدورفت کے ذریعوں میں ترقی ہونے کی وجہ سے ورکشاپوں کی شدت سے ضرورت محسوس ہونے لگی۔

1901ء میں لارڈ کرزن نے شملہ میں پہلی آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس منعقد کی۔ اسی سال پورے ہندوستان کے لیے ڈائریکٹر جنرل آف ایجوکیشن کا عہدہ قائم کیا گیا۔

1904ء میں حکومت ہند نے ایک ریزولیشن کے ذریعے نئی تعلیمی پالیسی کا اعلان کیا۔ اس ریزولیشن میں حرفتی تعلیم کے لیے مضبوط اساس کی فراہمی پر زور دیا گیا۔ مادری زبانوں کی تدریس کے متعلق اس ریزولیشن میں طے کیا گیا کہ اصولاً کسی بھی طالب

Sanjh Lok Raj

علم کو اس وقت تک انگریزی سیکھنے کی اجازت نہ دی جائے۔ جب تک وہ تعلیم کے ابتدائی مدارج میں ترقی نہ کرے۔ مادری زبان میں مکمل مہارت ہونے کے بعد بھی انگریزی کو قبل از وقت دوسرے مضامین کا ذریعہ تدریس نہ بنایا جائے۔

1919ء میں ماٹنگ چمیسفورڈ اصلاحات نافذ ہوئیں تو اس کے بعد تعلیمی بجٹ میں اضافہ کے ساتھ ساتھ تعلیمی اداروں کی تعداد بڑھائی گی۔

1935ء میں ہندوستان کی آزادی کے لیے جوفری انڈیا ایکٹ منظور کیا گیا تو اس میں صوبائی خودمختاری کا اصول نافذ کیا گیا جس سے وزیر تعلیم کے اختیارات بڑھا دیئے گئے۔

1936ء سے 1947ء تک کا سارا سفر غیر پیداواری تعلیم کے پھیلاؤ کا سفر ہے۔ مندرجہ ذیل جدول سے آپ کو 40 کروڑ کی آبادی کے ملک ہندوستان میں خواندگی کی شرح کا علم بھی ہو جائے گا۔

	ادارہ کی قسم	اداروں کی تعداد		طلباء کی تعداد	
		1921-22ء	1936-37ء	1921-22ء	1936-37ء
1	یونیورسٹیاں	10	15	اعداد نامعلوم	9697
2	آرٹ کالج	165	217	45418	86273
3	پیشہ وارانہ کالج	64	75	13662	20645
4	ثانوی مدراس	7530	13056	1106803	2282872
5	پرائمری مدارس	155017	192344	6109752	10224288
6	اسپیشل مدارس	3344	5647	120925	259269
	میزان مسلمہ ادارے	166130	211308	7396560	12888044
7	غیر مسلمہ ادارے	16322	16647	422165	501530
	جملہ میزان	182452	227955	7818725	13389574

ترقی اردو بیورونٹی دہلی کی چھپی ہوئی محمد عبدالقادر عماردی کی کتاب ''سماج اور تعلیم''

Sanjh Lok Raj

سے لیا جدول۔

کالونیل ریاست نے غلام ہندوستانیوں کی تعلیم کے لیے جو مقاصد متعین کیے ان کا اظہار نصاب سے ہوتا ہے۔ کالونیل آقاؤں کا مفاد یہ تھا کہ ہندوستان کو معاشی لحاظ سے زراعت پر جامد کر دیا جائے جو برطانیہ کی صنعتوں کے لیے سستا خام مال مہیا کرے اور بڑی آبادی کی وجہ سے برطانوی مصنوعات کے خریداروں کی سب سے بڑی منڈی ہو۔ یہ صنعتی طور پر ترقی نہ کرنے پائے۔ بڑی آبادی کو غربت میں رکھا جائے تاکہ یہاں سے فوجی بھرتی کی جائے جو دنیا بھر میں برطانوی سرمایہ داری کی حفاظت کرنے کے لیے لڑے۔ غیر پیداواری تعلیم کا سارا نصاب مابعدالطبیعات کے تابع سماجی علوم اور تھیوریٹکل سائنس پر مبنی تھا۔ لیکن غیر پیداواری نصاب تعلیم تو کالونیل تعلیمی ڈھانچے کا محض ایک جزو ہے جبکہ اس کے باقی اجزاء تدریس کا حاکمیتی ماڈل۔ زبان کی سامراجیت اور تعلیم کی ذمہ داری کا تعین ہیں۔

Sanjh Lok Raj

تدریس کا حاکمیتی ماڈل

آمرانہ بادشاہتوں اور جاگیردارانہ ملکیتوں کے دور میں حاکم اور محکوم کے درمیان تعلقات کو جاگیردار، رعایا، رشتے کا نام دیا جاتا تھا۔ جاگیرداروں اور بادشاہوں نے چونکہ دنیا کے تمام ہی ملکوں پر صدیوں بلکہ ہزاروں سال حکومت کی ہے اس دوران معاشروں میں ایک جاگیرداری کلچر بھی پروان چڑھا ہے۔ ہندوستان کے جغرافیائی خطے میں بھی جاگیرداروں نے ہزاروں سال حکومت کی ہے یہاں تک کہ جاگیردار کی ذیل میں بسنے والی آبادی یعنی رعایا حکمرانی کی اس طرز کو انسانی فطرت کے عین مطابق اور ناگزیر سمجھتی تھی۔ جاگیردار اور اس کے خاندان کے چھوٹے سے بچے کو بھی ''مائی باپ'' کا لقب دیا جاتا تھا۔ رعایا اپنے حاکموں کو کسی بیرونی خطرے سے بچانے کے لیے اور ان کے خزانے بھرنے کو اپنی پیدائش کا مقصد جانتی تھی۔ یہ جاگیرداری کلچر کی اقدار کہلاتی ہیں۔ اسے پدری نظام بھی کہا جاتا ہے جب کسی ملک پر غیر ملکی قابض ہو جائے تو ''مائی باپ'' کا رشتہ آقا اور غلام کے رشتے میں بدل جاتا ہے۔ غلام اور آقا کا رشتہ سخت گیر نظام مراتب میں اپنی ذلت آمیز غلامی اور حقارت بھرے مقام کو بخوشی قبول کرنا اور اوپر سے دیئے گئے احکامات کو بلا حجت تسلیم کرنے پر منحصر تھا۔ یہ کام سزاؤں کے خوف۔ ذلت و بے قدری کے ڈر اور مسلسل حوصلہ شکنی کے عمل سے گزرنے سے کیا جاتا تھا۔ اوپر سے اعتقادی نظام جو غلامی کو نہ صرف یہ کہ حاکمیت اور کنٹرول کو قبول کرنے بلکہ غلامی میں کمال حاصل کرنے کو عظمت قرار دیتا تھا۔ معاشرے کا اس طرح کا ماڈل حاکمیتی ماڈل کہلاتا ہے۔

حاکمیتی ماڈل صرف سماجی ڈھانچہ ہی نہیں ہوتا بلکہ خاندان کا ماڈل۔ جاگیرداری معاشرے میں سیاسی پارٹیوں کا ماڈل۔ پیروں اور مریدوں کا ماڈل یہاں تک کہ سکول اور کلاس روم کا ماڈل بھی ہو سکتا ہے۔ ایسے حاکمیتی ماڈل میں سخت گیر مردانہ حاکمیت۔ اونچی سطح کا

خوف۔ تشدد اور بدسلوکی کا خطرہ ہر وقت سر پر منڈلاتے رہنا۔ سب کچھ بلا چون چرا قبول کرنے اور تابعداری میں کمال حاصل کرنے کی مشق کروائی جاتی ہے۔ عقائد، حکایات واقدار نہ صرف اس حاکمیتی ماڈل کو زندگی کا اٹل اور ناگزیر حصہ بنا کر پیش کرتے ہیں بلکہ اس کو محکوموں کی بھلائی کا پروگرام بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ درباری دانشور اسے انسانی فطرت قرار دیتے ہیں اور درباری قاضی اسے عین انصاف بتاتے ہیں لہٰذا اکثریت خود کو بڑے احسن طریقے سے حاکم اقلیت کے وضع کردہ مقاصد کے مطابق ڈھالتی رہتی ہے۔ علامہ اقبال نے خاص طور پر تہری غلامی کو ''اے کشتہ، سلطانی و ملائی و پیری'' کہا ہے۔

ہندوستان کے جغرافیائی خطے کے بسنے والے لوگ بادشاہی کے دور سے نکل کر سیدھا کالونیل دور میں چلے گئے۔ ہمارے تدریسی نظام کی جڑیں بھی حاکمانہ اور غیر منصفانہ بادشاہی اور کالونیل دور میں پیوست ہیں۔ چونکہ کالونیل آقاؤں نے ہمارے سماجی ارتقا کو اپنے کالونیل مقاصد کی مطابقت میں تشکیل دیا ہے۔ اس لیے ہماری تعلیمی ترقی بھی کالونیل آقاؤں کے بدلتے ہوئے مفادات کے تابع آج تک اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہے۔

تدریس کے حاکمیتی ماڈل میں تعلیم خبری ہوتی ہے اور استاد مرکوز۔ اور استاد ہمیشہ سچی خبر دیتا ہے استاد کا فرض ہے کہ ذہن کے خالی برتنوں کو اپنی طرف سے دی گئی معلومات سے بھرنا۔ کیونکہ استاد سب کچھ جانتا ہے اور طلبا کچھ نہیں جانتے۔ استاد پڑھاتا ہے اور طلباء سیکھتے ہیں۔ استاد طلباء کو نظم وضبط کا پابند بناتا ہے اور طلباء کو اس نظم وضبط کے مطابق ڈھلنا ہوتا ہے۔ کائنات اور انسان کے بارے میں سچی معلومات کے دو ہی ذرائع سمجھے جاتے ہیں، مذہب اور استاد۔ استاد بنیادی طور پر سبق تقسیم کار اور کنٹرولر ہوتا ہے۔ جبکہ طلباء کو ڈسپلن میں ڈھالا جاتا ہے۔ تدریس کے اس طریقے کو تدریس کا حاکمیتی ماڈل کہا جاتا ہے۔ جو طلباء کو حالات کے مطابق ڈھلنے۔ احکامات کو من وعن تسلیم کرنے اور قابل انتظام وجود بنانے میں مدد کرتا ہے۔

عظیم مفکر تعلیم پولو فرائرے نے تعلیم کے حاکمیتی ماڈل کو بنکنگ نظریہ تعلیم کہا ہے۔ وہ ایسی تعلیم کو انسانوں کو سدھانے کا عمل اور غلامی کی مشق قرار دیتا ہے۔ بنکنگ نظریہ تعلیم اس لیے کہا گیا ہے کہ جس طرح بنک میں رقم جمع کروائی جاتی ہے۔ اس طرح طلباء کے ذہنوں کے خالی برتنوں کو معلومات سے بھرا جاتا ہے۔ یہ معلومات مفہوم سے خالی لفاظی پر مشتمل ہوتی

ہیں جیسے روحانی اقدار قوت متخیلہ وغیرہ۔ یہ معلومات ایسی چیزوں پر مبنی ہوتی ہیں جن کا اب وجود باقی نہیں رہا۔ جیسے خلافت مگر پاکستان کا دارالخلافہ اسلام آباد ہے۔ یہ معلومات ایسے ماورائی اور مابعدالطبیعاتی مواد پر مبنی ہوتی ہیں جن کا تاریخ میں ٹھوس اور معروضی وجود نہیں ہوتا۔ اور ایسا تعلیمی مواد جس کے بارے میں طلباء یہ نہیں جانتے کہ جمع ہونے والا مواد بذات خود حقیقت کے بارے میں بہت سے تضادات پر مشتمل ہے۔ ایسا مواد تنقیدی بیداری پیدا کرنے کی بجائے مفاہمت پیدا کرتا ہے۔ کلاس روم میں طلباء کو غلامی کی عملی مشق کروائی جاتی ہے اس طرح سے تعلیم حاصل کیا ہوا شخص تعلیم سے فارغ ہو کر معاشرے کا حصہ بننے پر حکمران طبقے کا اتنا ہی تابعدار ہوتا ہے۔ جتنا کلاس میں استاد کا ہوا کرتا تھا۔ اس طرح سے ڈھلا ہوا انسان حاکمیتی ماڈل کے ذریعے تعمیر کردہ معاشرے کی عمارت کا ایک تعمیری بلاک ہوتا ہے۔ ایسا انسان معاشرے کو ایک جامد اکائی سمجھنے پر تربیت کیا گیا ہوتا ہے۔ تعلیم بطور تسلطی مشق اس میں یہ سوچ پیدا کرتی ہے کہ وہ نہ تو خود کو اور نہ اپنے گرد کے حالات کو بدل سکتا ہے۔ وہ سدھایا گیا ہوتا ہے کہ کائنات اور اس کی زندگی میں ہونے والا ہر کام پہلے سے طے شدہ ہے۔ اس طرح اس کی زندگی کا ہر عمل مفہوم و معانی سے عاری ہونے لگتا ہے۔ خیر و شر کے مجرد اصولوں میں دلچسپی لیتا ہے اور چند ایسے محکم اور قیاسی اصولوں کی تلاش میں رہتا ہے اور خود کو دنیا سے لاتعلق کر لیتا ہے۔ یہ لاتعلقی اس کو ماورائیت اور مابعدالطبیعات پر یقین میں پختگی عطا کرتی ہے یہاں تک کہ وہ اونچی سطح پر اور نظر نہ آنے والی حاکم اقلیت کے فیصلوں کے اپنی زندگی پر مرتب ہونے والے اثرات کو ماورائی فیصلوں کا نتیجہ سمجھنے لگتا ہے۔

تدریس کا حاکمیتی ماڈل ایسا حاکمیتی، تحکمانہ اور خطیبانہ نظام ہے۔ جو استاد، نصاب اور امتحان کے گرد گھومتا ہے۔ اس میں طالب علم کے لئے ذاتی تجربہ کرنے۔ تعلیم کو اپنے تجربے کا حصہ بنانے۔ اپنی انفرادی اصلیت دریافت کرنے۔ مروجہ نظریات و تصورات سے بالاتر ہو کر سوچنے کی گنجائش ہی پیدا نہیں ہونے دیتا۔

بچے جو پیدائشی طور پر متجسس ہوتے ہیں۔ سیکھنے، مفہوم و تکمیل کی اپنی ضروریات کو پورا کرنے۔ تخلیقیت اور ہمدردی کی اپنی صلاحیتوں کو کام میں لانے کے بھوکے ہوتے ہیں مگر تدریس کے حاکمیتی ماڈل کے ذریعے حرف بہ حرف مطابقت پر مجبور کر دیئے جاتے ہیں اور بغیر

Sanjh Lok Raj

کسی تنقید کے عاجزی کے ساتھ اپنی محکومی تسلیم کر لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ کیا تدریس کے لیے حاکمیتی تعلقات ناگزیر ہیں؟

یا اس کا کوئی قابل عمل متبادل موجود ہے؟ کیونکہ درست انتخاب کے لیے ہمیں متبادلات کو سمجھنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں جب یورپ میں تعلیم پیداواری عمل کا حصہ بن گئی تو پیداوار میں اضافے کے لیے نئے نصاب متعارف کروائے گئے اور تدریس کے طریقہ میں بھی تبدیلیاں لائی گئیں۔ مگر حاکمیتی ماڈل کو اب بھی برقرار رکھا گیا کیونکہ یہ صنعتی اسمبلی لائن کے لیے مناسب تھا۔ جہاں صنعتی مشین میں کارکنوں کو محض ایک پرزے کی طرح اوپر کسے احکامات بلا حجت اوران پر سختی سے عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا تھا۔ جیسے جیسے مزدوروں میں اپنے سیاسی اور معاشی حقوق کا شعور بڑھا تو مزدوروں نے اپنی یونینیں بنائیں اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا۔ ان کی جدوجہد کے نتیجے میں سرمایہ دار حکمران طبقے نے معاشی حقوق دینے کی بجائے انھیں صرف سیاسی حقوق ہی دیئے۔ اس طرح مزدوروں کی جدوجہد کے نتیجے میں صنعتی معاشروں کی جمہوریت کاری میں اضافہ ہوا۔

سب کے لیے برابر مواقع۔ تعلیم پر سب کے برابر حق کا آئین اور قانون کی کتابوں میں موجود ہونا اور عملی طور پر صرف سرمایہ دار طبقے کا اس حق سے فائدہ اُٹھانا طبقاتی معاشرے کا بنیادی تضاد ہے۔ جب سرمایہ داری کے تضادات کو حل کرنے کے لیے سائنسی سوشلزم کا نظریہ وجود میں آیا تو اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبے پر پڑے۔ جب ڈیوی جیسے ترقی پسند مفکر تعلیم نے عملی ذہن۔ پہل کرنے کا حوصلہ۔ خود اپنی تخلیقی ذہانت کے ذریعے اپنے مسائل کو حل کرنے کی انسانی صلاحیت پر اعتماد اور شخصی آزادی کو تعلیم کا مقصد قرار دیا تو تدریس کے حاکمیتی ماڈل سے ایسے مقاصد کا حصول ممکن نہیں تھا۔ کیونکہ حاکمیتی ماڈل تو ذہنوں کو ایسی تربیت دینا چاہتا تھا جس سے موجودہ دنیا سے پہلے کے ڈھانچے میں تغیر نہ لایا جا سکے بلکہ اسے قائم رکھنے کی مہارت پیدا ہو۔ اس کے برعکس ان مقاصد کا حصول ایسے طریقہ تدریس سے ممکن تھا۔ جس میں ذہنوں کی اس طرح تربیت کی جائے کہ اذہان ترقی پذیر۔ تدریجی اور ارتقائی تغیر کے ساتھ چلنے کے قابل ہو جائیں۔ اور انسانیت کے اجتماعی مفادات کے محافظ ہوں۔ ایسے طریقہ تدریس کو تدریس کا شراکتی ڈھانچہ کہا جاتا ہے پولو فرائرے نے اسے

Sanjh Lok Raj

آزادی بخش تعلیم کا نام دیا ہے۔ آزادی بخش تعلیم شعور اور تجزیہ پر مشتمل ہوتی ہے نہ کہ معلومات کی منتقلی پر۔ شراکتی تعلیم یعنی تعلیم بذریعہ تعاون۔ شراکتی عمل سے بچوں کے تجسس کو تقویت دینا۔ مہم جوئی کے ذریعے سیکھنے میں نوجوانوں کی مدد کرنا۔ جس میں اساتذہ کنٹرولر کی بجائے آسانی پیدا کرنے والے اور اسباق کو بچوں کے ذہنوں میں جمع کروانے کی بجائے مکالماتی یا سقراطی شراکتی انداز سے ذہنوں کو وسعت دینا ہوتا ہے۔ یہی وہ سب کچھ ہے جس سے طلباء دنیا اور اس میں اپنے مقام کے بارے میں تصورات وضع کرتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

ذریعہ تعلیم

انسانی بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو اس کے سر میں دماغ اور جسم میں حواس تو موجود ہوتے ہیں مگر شعور ابھی تک وجود میں نہیں آیا ہوتا۔ گھر کا کوئی بزرگ اس بچے کا نام رکھتا ہے۔ گھر کے تمام افراد بچے کو اس کے نام سے پکارتے ہیں مگر اسے پتہ نہیں کہ میں کون ہوں۔ کہاں ہوں اور مجھے کیا کہا جا رہا ہے۔ وہ آنکھیں کھولتا ہے مگر کچھ دیکھ نہیں رہا ہوتا۔ کسی آواز پر ہلتا جلتا ہے مگر کچھ سن نہیں رہا ہوتا۔ انسانی بچے کے دماغ میں شعور کب اور کیسے جنم لیتا ہے اس کی ابتدائی شکل کیا ہے پھر کس طرح نشو ونما پاتا ہے یہ ایک باقاعدہ علم ہے جس کو (Ontogenetic) کا نام دیا گیا ہے۔ نیورو سائنس ہی کے علم کا دوسرا شعبہ (Philogenetic) ہے جس کا موضوع یہ ہے کہ ابتدائی انسان نے شعور کس طرح تخلیق کر لیا اور کن مراحل سے گزر کر موجودہ شکل میں آیا۔ تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ دونوں میں مماثلت پائی جاتی ہے۔

ابتدائی چند ماہ میں بچہ ارد گرد کی چیزوں کو دیکھتا ہے تو ان کا عکس اس کے دماغ کے پردے پر پڑتا ہے یہ عکس اور بچے کا ردعمل لمحاتی اور وقتی ہوتا ہے۔ یادداشت ابھی دور دور تک کہیں موجود نہیں۔ کچھ ماہ گزرنے کے بعد جب بچہ کوئی چیز دیکھتا ہے تو ساتھ ہی اس کے کان میں گھر کے افراد میں کسی کی آواز پڑتی ہے۔ جیسے پانی پر تیرتے ہوئے پرندے کو بچہ جب دیکھ رہا ہوتا ہے تو ماحول سے کسی کی آواز آتی ہے ''بطخ''۔ تیرتے ہوئے پرندوں کا عکس اور آواز ''بطخ'' کے درمیان دماغ میں عصبی ربط (Neuro association) قائم ہو جاتا ہے۔ بالکل اس طرح جیسے فلم کے فیتے پر آواز کی پٹی ہوا کرتی تھی۔ پھر آئندہ زندگی میں عکس اور آواز اس طرح جڑے ہوتے ہیں کہ بچہ جب کبھی بطخ کو دیکھتا ہے تو اس کی زبان کہتی ہے ''بطخ'' یا جب کبھی لفظ ''بطخ'' سنتا ہے تو اس کا ذہن بطخ کا عکس اُبھار لیتا ہے۔ اس طرح چیزوں کے عکس اور

Sanjh Lok Raj

وہ الفاظ جو ان چیزوں کے نام ہوتے ہیں دماغ میں محفوظ ہونا شروع ہو جاتے ہیں اور یادداشت کی ابتدا ہوتی ہے۔

بچے کی ماں بچے کے گندے ہاتھوں کو دھو کر صاف کرتی ہے۔ بچے نے دھونے کا عمل دیکھا اور اس عمل کو دھونے کے لفظ کے ساتھ ساتھ دماغ میں محفوظ کر لیا۔ اب آہستہ آہستہ کئی نام اور کئی اعمال لفظوں کی شکل میں بچے کے ذہن میں محفوظ ہو گئے۔ یادداشت میں کچھ الفاظ کا اضافہ ہوا۔

نیورو سائنسٹسٹ کہتے ہیں کہ شروع میں فکر غیر لفظی ہوتی ہے اور زبان غیر عقلی، یعنی ابھی سوچنے اور الفاظ کا ربط نہیں ہوا ہوتا۔ دو سال تک سوچنے اور بولنے کے خطوط آپس میں مل جاتے ہیں یہ عمل ہے بولے جانے والے الفاظ میں مفہوم پیدا کرنے کا۔ سوچ کر بولنا اور بولنے کے پیچھے سوچ کا ہونا۔ اب زبان اور شعور ایک دوسرے کے ساتھ پیوست ہو جاتے ہیں۔

زبان نہ صرف الفاظ سکھاتی ہے بلکہ الفاظ کی ایک خاص ترتیب کے ذریعے فکر اور سوچنے کے ڈھنگ کو بھی بچوں میں منتقل کرتی ہے۔

جیسے اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ انسان کو قوت گویائی عطا کی گئی ہے تو یہ ایک مابعدالطبیعاتی سوچ ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ انسان نے اپنی سماجی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے زبان تخلیق کر لی تو یہ فقرہ سائنسی سوچ کی عکاسی کرتا ہے۔ اس طرح بڑوں کے ادا کیے گئے فقروں ہی سے مابعدالطبیعاتی یا سائنسی سوچ اگلی نسل کو منتقل ہو رہی ہوتی ہے۔

نیورو نفسیات دان وائیگوٹسکی کہتا ہے کہ بچے کے ذہنی ارتقا کا مرکز زبان ہے۔ زبان شعور کا وسیلہ ہے زبان ہی سوچ کا میکنزم تخلیق کرتی ہے۔ زبان کے بغیر منظّم فکر ممکن نہیں۔ جب تک کسی شے کا تصور لفظ کا قالب اختیار نہ کرے اس وقت تک اس پر غور کرنا ممکن نہیں۔ ذرا کوشش کریں کہ ذہن میں الفاظ کو لائے بغیر مظاہر فطرت کی ماہیت اور ان کا آپسی تعامل سمجھ میں آئے تو معلوم ہو گا کہ ایسا ممکن نہیں ہے۔۔ مطلب یہ کہ ہم سوچتے ہی لفظوں میں ہیں یعنی سوچنے کی بھی زبان ہوتی ہے۔ جو تصورات آپ کے ذہن میں چل رہے ہوتے ہیں وہ الفاظ کی شکل میں ذہن میں چل رہے ہوتے ہیں۔ اور یہ الفاظ اس کی مادری زبان کے ہوتے ہیں۔ کبھی آپ نے کسی شخص کو خاموش بیٹھے ہوئے دیکھا ہو جس کے ہاتھ اس طرح

Sanjh LokRaj

حرکت کر رہے ہوں جیسے بولتے وقت کرتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ یہ دل میں باتیں کر رہا ہے۔ آج کا انسان لفظوں میں سوچتا ہے جو کہ اس کی مادری زبان ہوتی ہے۔ یعنی مادری زبان سوچنے کی زبان بن گئی ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ پنجابی بچہ فرانسیسی زبان میں سوچے یا سندھی بچے کو جرمنی زبان میں کہی گئی بات اتنا ہی متاثر کرے جتنا اس کی سوچ کو اس کی مادری زبان متحرک کرتی ہے۔

ترسیل فکر میں مادری زبان سے بڑھ کر کوئی اور ذریعہ مؤثر نہیں ہو سکتا اس لیے ساری دنیا کے ماہرین تعلیم اس بات پر متفق ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو مادری زبان کو ذریعہ تعلیم ہونا چاہیے۔ یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ کسی دوسری زبان کو سیکھنے کے لیے ہمیں ایک طویل عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اور برس ہا برس کی تعلیم و تدریس کے بعد بھی ہمیں دوسری زبان پر وہ قدرت حاصل نہیں ہوتی جو زندگی کے ابتدائی برسوں میں مادری زبان سیکھنے میں غیر شعوری طور پر حاصل ہو جاتی ہے۔ حالانکہ بعد میں جو زبان ہم سیکھتے ہیں اس وقت ہمیں قواعد، زبان کے اصول اور طریقوں سے بھی واقفیت ہوتی ہے لیکن اس کے باوجود ایک نئی زبان سیکھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

نیورولوجسٹوں اور ماہرین نفسیات کی مشترکہ تحقیق کے مطابق انسانی ذہن کا میکنزم کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ابتدائی اور فطری طور پر اوّلین تاثرات ہی کو پورے طور پر قبول کرتا ہے یہ تاثرات تا زندگی قائم رہتے ہیں اس لیے سیکھنے کے لیے ان ابتدائی برسوں کو سب سے اہم قرار دیا گیا ہے۔ انھیں ذہن کی تعمیر کے ابتدائی سال کہا جاتا ہے جن میں فکر اور یادداشت کی صلاحیتیں تشکیل پاتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم تحقیق ماریہ مانٹیسوری کی ہے۔ اس تحقیق کے مطابق بچے کو ابتدائی تعلیم اس کے ماحول کی زبان میں دینی چاہیے تاکہ اس کے ذہن کی نشو و نما جاری رہے۔ اس تحقیق پر مزید تحقیقات ہوئیں اور یہ نتائج سامنے آئے کہ:

1 غیر مادری زبان میں تعلیم رٹے کا رواج پیدا کرتی ہے جو محض لفظوں کی جگالی ہوتی ہے۔

2 غیر مادری زبان میں تعلیم خاموشی کا کلچر پیدا کرتی ہے جو فکری صلاحیتوں کو ماند کرتا ہے۔

3 رٹے کا رواج اور خاموشی کا کلچر مل کر بچوں میں تعلیم سے اکتاہٹ کے رجحان میں اضافہ کرتے ہیں۔

Sanjh Lok Raj

آپ یہ بات ایک چھوٹے سے تجربے سے سمجھ سکتے ہیں۔ تین بچے جو کہ پرائمری کلاس کے طالب علم ہوں ان میں سے ایک بچے کو اس کی مادری زبان میں بتائیں کہ ''بچہ پھول توڑ رہا ہے'' دوسرے کو یہی بات عربی زبان میں بتایئے ''**الولد یقطف الاذھار**'' اور تیسرے کو یہی بات فرانسیسی زبان میں بتایئے ''Enfant est plumaison fleur''۔ اب کسی دوسرے وقت میں ان بچوں سے پوچھیے کہ آپ کو کیا بتایا گیا تھا؟ جس بچے کو آپ نے اس کی مادری زبان میں بتایا ہوگا وہ فوری طور پر آپ کو بتا دے گا کیونکہ بچے کا عکس۔ پھول کا عکس اور توڑنے کے عمل کا عکس اس کے ذہن میں محفوظ ہے۔ لیکن دوسرے بچے جن کو آپ نے عربی یا فرانسیسی میں بتاتا تھا انکے ذہن میں بچے کا عکس تو ہے مگر بچے کے عکس کے ساتھ ''**الولد**'' یا Enfant کی آواز محفوظ نہیں۔ نہ ہی انہیں ''**یقطف**'' یا Plumaison کا پتا ہے۔ حالانکہ توڑنے کے عمل کا تصویری عکس بچے کے ذہن میں موجود ہے۔ آپ بچوں کو مجبور کریں کہ اگر انہوں نے غیر مادری زبان کے یہ الفاظ یاد نہ کیے تو انہیں سزا ملے گی تو سزا کے خوف سے وہ بچہ الفاظ یاد کر لے گا اسے رٹا کہتے ہیں۔ سائنس ہو یا مذہب۔ کسی بھی چیز کے حافظ بننے سے وہ نتیجہ پیدا نہیں ہوتا۔

ہمارے طالبعلمی کا دور فلم بینی کا دور تھا۔ طلبا کے لیے رعایتی ٹکٹ بھی ہوا کرتی تھی۔ فلم دیکھ کر طلبا جب اس کی کہانی دوسرے دوستوں کو سناتے تو بعض اوقات انہی میں سے کوئی کہہ دیتا کہ فلم کی سٹوری آپ کو حرف بہ حرف یاد ہوتی ہے سبق یاد کر کے کیوں نہیں آتے؟ اس وقت تو اس کی وجہ معلوم نہیں تھی مگر آج یہ بات وثوق سے کہی جا سکتی ہے کہ مادری زبان کو ہم نے فلم کی طرح دیکھا ہوتا ہے۔ ہمارے سامنے زندگی کی فلم کے ذریعے مادری زبان ہماری یادداشتوں میں موجود ہوتی ہے۔ غیر زبان کو سبق کی طرح زور لگا کر یاد کرنا پڑتا ہے۔ اس طرح رٹا کلچر پروان چڑھتا ہے جس سے تعلیم کے بارے میں اکتاہٹ پیدا ہو جاتی ہے دلچسپی پیدا نہیں ہو پاتی جس سے سکولوں کی ڈراپ آؤٹ میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

پاکستان میں اب بھی دیہاتی آبادی 70 فیصد ہے۔ شہری آبادی میں تو خیر اب مائیں یہ کوشش کرتی ہیں کہ بچوں کے ساتھ اردو میں بات کریں مگر دیہاتی مائیں اپنے بچوں کے ساتھ مقامی زبان پنجابی، سندھی، بلوچی یا پشتو میں بات کرتی ہیں۔ بچے جب سکول جاتے ہیں تو استاد

Sanjh Lok Raj

ان بچوں سے اردو میں سوال کرتا ہے بچے بھی اس کا جواب اردو ہی میں سوچتے ہیں یا مادری زبان میں سوچ کر اردو میں ترجمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دماغ کا یہ عمل ان کی زبان کو جام رکھتا ہے۔جس سے خاموشی کا کلچر جنم لیتا ہے۔حکمران طبقے کو خاموشی کے کلچر کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔ خاموش لوگ مکالمے اور تنقید سے عاری ہوتے ہیں وہ بس دل میں کڑھنا جانتے ہیں۔

دنیا کے ممالک پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہو گا کہ سوائے ان ممالک کے جو بیرونی اقتدار کے تحت نو آبادی کی حیثیت رکھتے تھے۔ دیگر تمام ممالک میں مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم رکھا گیا کیونکہ یہ بات فطرت کے عین مطابق ہے۔ چنانچہ یورپ کے چھوٹے ممالک میں بھی مادری زبان ہی ذریعہ تعلیم ہے۔ باوجود اس کے کہ یورپ کی چند بڑی زبانیں مثلاً انگریزی، فرانسیسی، جرمن اور روسی زبانیں بہت ترقی یافتہ ہیں ان ترقی یافتہ زبانوں کو اگر چھوٹے ملک چاہتے تو کسی کو اپنا ذریعہ تعلیم بنا سکتے تھے لیکن مادری زبان کی تعلیم کے لیے اہمیت کو سمجھتے ہوئے انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اس کا فائدہ یہ ہوا کہ کم آبادی رکھنے والی اقوام کے لوگ غیر مادری زبان کی پیچیدگیوں اور ذہنی الجھاؤ سے بچ گئے جس کے نتیجے کے طور پر وہ اپنی توانائیوں کو زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے سے تحصیل علوم کے بے شمار میدانوں میں صرف کر کے ترقی کرتے رہے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت کی وجہ سے انگریزی زبان کو سرکاری اور تعلیمی زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خطہ ہندوستان کے ممالک میں سارا علم غیر ملکی زبانوں تک محدود رہا اور علاقائی زبانوں میں بہت کم علمی سرمایہ منتقل ہو پایا۔ مقامی زبانیں بڑی حد تک زندگی کے خانگی شعبوں تک محدود رہیں اس وجہ سے زبان کے ارتقا کی رفتار سست رہی اور تعلیم عام آدمی کی دسترس سے باہر رہی۔ اعلیٰ تعلیمی سطح پر جدید علمی و سائنسی معلومات کو مقامی زبانوں میں منتقل نہیں کیا جا سکا جس کی وجہ سے جدید علوم اور مقامی زبانوں کے علمی سرمایہ میں کافی دوری پیدا ہو گئی۔ اس دوری کی وجہ ہی سے آج کل بھی لوگ انگریزی زبان کے ذریعہ تعلیم کی برقراری پر بضد ہیں۔

حکمران طبقہ تعلیم کے جو مقاصد طے کرتا ہے تعلیمی پالیسی کو ان مقاصد کے حصول کے لیے مرتب کرتا ہے۔ زبان یعنی ذریعہ تعلیم اس پالیسی کا اہم حصہ ہوتا ہے۔ اگر تعلیم عام کرنی ہو اور ہر شخص کی پہنچ میں کرنی ہو تو اس کے لیے پالیسی بھی ویسی ہی بنائی جاتی ہے۔ اگر

Sanjh Lok Raj

عام لوگوں کو تعلیم سے دور رکھنا ہو اور کاروبارِ حکومت چلانے کے لیے چند لوگوں کو تعلیم دینا ہو تو پالیسی بھی اس کی مطابقت میں بنائی جاتی ہے۔ لارڈ میکالے کی 1935ء کی تحریر میں اس نے برطانوی حکومت کی طرف سے غلام ہندوستانیوں کے لیے تعلیم کا جو مقصد قرار دیا وہ یہ تھا:

''فی الحال ہمیں ایک ایسے طبقے کی تیاری کی پوری کوشش کرنی چاہیے جو ہمارے اور ان کئی ملین افراد کے درمیان رابطے کا سبب بن سکیں جن پر ہم حکومت کرتے ہیں۔ یہ افراد کی ایسی جماعت ہو گی جو رنگ اور خون کے اعتبار سے ہندوستانی ہو گی لیکن ان کا مزاج اور رجحانات، اخلاق اور ذہن انگریزی ہو گا۔ یہ بات اس طبقہ پر منحصر ہے کہ اپنے ملک کی مقامی بولیوں کو ستھرا بنائیں اور سائنس کی اصطلاحات مغربی اصطلاحات سے حاصل کر کے انھیں مالا مال کریں پھر بتدریج عوام تک علم کی ترسیل کا انہیں ذریعہ بنائیں۔''

اس پر بحث کرتے ہوئے میتھو آرنلڈ (Methew Arnold) کہتا ہے۔

علم کی ترویج ہندوستان کے بالائی طبقوں سے عام لوگوں کی طرف اس طرح جانی چاہیے جیسے ہمالیہ پر پگھلنے والی برف کا قطرہ قطرہ نیچے پیاسے میدانوں کی طرف رستہ چلا جاتا ہے۔

1837ء میں انگریز حکومت نے عدالتوں سے فارسی زبان کو رخصت کر دیا اور انگریزی زبان رائج کر دی۔ 1847ء میں یہ فرمان جاری ہوا کہ صرف انگریزی پڑھے لکھے لوگوں کو سرکاری ملازمت ملے گی لیکن 1904ء تک برطانوی حکمران اس بات کے قائل ہو گئے تھے کہ عوام الناس کو تعلیم انہی کی مادری زبان میں دی جائے۔

اس لسانی پالیسی کو 1904ء میں گورنر جنرل کی جاری کردہ ''انڈین ایجوکیشنل پالیسی'' کی دستاویز میں اس طرح بیان کیا گیا ہے، ''انگریزی کو ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کرنے سے ہمیں کاروباری فائدہ ہوتا ہے مگر اس سے مقامی زبانیں پسماندہ رہ جاتی ہیں۔ بہتر تعلیم کے لیے ضروری ہے کہ بچہ مڈل تک اپنی مادری زبان پر دسترس حاصل کرے اس کے بعد اسے انگریزی بطور زبان سکھانے کا عمل شروع کیا جائے تب تک انگریزی کو کسی بھی مضمون کو پڑھانے کے لیے ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے۔ ہندوستانی سکولوں میں عام رواج یہ ہے کہ نصابی کتب کو سمجھے بغیر رٹا لگا لیا جاتا ہے۔ اس کی وجہ وہ طلباء ہیں جنھیں ضروری اہلیت پیدا کیے بغیر انگریزی میں تعلیم دینا شروع کر دی گئی تھی۔ مادری زبان کو تعلیم کے مکمل ہونے تک جاری رہنا چاہیے۔''

Sanjh Lok Raj

لیکن اس پر کبھی عملدرآمد نہیں ہوا نہ انگریزوں کے زمانے میں اور نہ ہی ان کے 1947ء میں ہندوستانی خطے کے ممالک کو عالمی سرمایہ داری کے حوالے کرنے کے بعد آج تک۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برطانوی نوآبادیوں میں آج تک انگریزی زبان کی حکومت قائم ہے۔ برٹش کونسل کی 84-1983 کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ ''انگریزی زبان بحرشمالی کے تیل کے ذخائر سے بڑا برطانیہ کا سرمایہ ہے۔ ہمارے پاس اپنی بات منوانے کی طاقت تو نہیں مگر برطانیہ کا اثر قائم ہے جو اس کے معاشی اور فوجی وسائل سے بڑھ کر ہے اور وہ یہ کہ انگریزی زبان کو سائنس، تجارت اور ٹیکنالوجی کی زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اس کی ضرورت تب تک باقی رہے گی جب تک پوسٹ کالونیل ملکوں میں ذریعہ تعلیم انگریزی رہے اور ہم ان کی طلب کو پورا کرتے رہیں گے اور سرمایہ اکٹھا کرتے رہیں گے۔

ڈنمارک کی اوسکالڈ یونیورسٹی کے انگریزی کے پروفیسر رابرٹ فلپس نے اسے انگریزی زبان کی سامراجیت کہا ہے۔

Sanjh Lok Raj

نظریہ تعلیم بطور نظریہ سیاست

غیر پیداواری نصاب تعلیم ۔ تدریس کا حاکمیتی ماڈل اور مادری زبان کا ذریعہ تعلیم نہ ہونا اگرچہ کالونیل تعلیمی ڈھانچے کا لازمی حصہ ہیں مگر یہ سوال جو آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ کالونیل دور میں تھا وہ یہ کہ کیا تعلیم دینا ریاست کا فریضہ ہے؟ یا لوگوں کی اپنی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے تعلیم حاصل کریں؟ یا پھر سماجی خدمت کے ادارے قائم کیے جائیں جن کو امیر لوگوں کے صدقات اور خیرات سے چلایا جائے کچھ امداد حکومت بھی کرے؟ اگر تعلیم ریاست کی ذمہ داری ہے تو کیا ریاست اپنی پوری آبادی کو تعلیم دے یا چند لوگوں کو؟ ان چند لوگوں کا تعلق کس طبقے سے ہو؟

یہ وہ بنیادی سوال ہے جس کا تعلق کسی ایک فرد کے سیاسی خیالات سے ہے اور یہی وہ سوال ہے جس کا تعلق ریاست پر قابض حکمران طبقے کے سیاسی نظریئے اور طرزِ حکمرانی سے ہے۔ ہر سیاسی نظریہ اپنی کوکھ میں ایک تعلیمی نظریہ بھی رکھتا ہے۔ سرمایہ داری کا سیاسی نظریہ جسے ہم سرمایہ دارانہ جمہوریت کہتے ہیں کہ چونکہ معاشرے کا وجود قائم ہی طبقات کی وجہ سے ہے اگر طبقات نہ ہوں تو انسانی معاشرہ مٹ جائے۔ اس لیے جو طبقہ ذرائع پیداوار اور قدرتی وسائل کا مالک ہو وہی فیصلہ کرے کہ عام لوگوں کی بہت بڑی اکثریت نے کس طرح زندگی گزارنی ہے ان کے لیے قانون کیسا ہو۔ تعلیم کیسی ہو۔ سرمایہ داری میں چند لوگوں کو امیر ترین رکھنے کے لیے تمام تر وسائل کا رخ ان کی جیبوں کی طرف موڑا جاتا ہے اور چند گھرانوں کو خوشحال اور حاکم رکھنے کے لیے ایک بہت بڑی اکثریت کو غربت اور بدحالی میں رکھے جانے کا نام کیپٹل ازم ہے۔ طبقاتی تقسیم کے ذریعے بہت سے لوگوں کو چند لوگوں کا محتاج رکھنے کو معاشی عدل کہا جاتا ہے۔ طبقاتی تقسیم کی وجہ سے معاشرے کی بہت بڑی اکثریت کے ساتھ

Sanjh Lok Raj

ہونے والی بے انصافیوں، محرومیوں اور ان کی بے بسی کو خدا کے وجود کی دلیل کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت میں ریاست طبقہ اشرافیہ کی خدمت گار ہوتی ہے ایسے معاشرے میں قانون، انصاف، مذہب، اقتدار، طبقہ اشرافیہ کی خدمت کے لیے ہوتے ہیں۔ ایسی ریاست لوگوں کی ضروریات زندگی کو پورا کرنے کی ذمہ دار نہیں ہوتی بس انہیں ووٹ کا حق ہوتا ہے۔ رائے کے اظہار کی آزادی ہے اور معاشی طور پر بھوکے مرنے کی بھی آزادی ہے۔ اس سیاسی نظام کا عکس تعلیمی نظام میں اسطرح ہوتا ہے کہ اگر آپ کے پاس پیسے ہیں تو آپ تعلیم حاصل کریں۔ جتنے زیادہ پیسے ہیں اتنی اعلیٰ کوالٹی کی تعلیم حاصل کریں اگر آپ کے پاس پیسے نہیں ہیں تو آپ کو آزادی ہے کہ آپ تعلیم کی بجائے محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے لواحقین کا پیٹ پالیں۔ رقم جمع کریں اور اس سے اپنی آئندہ نسل کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کریں۔ سرمایہ داری جمہوریت میں تعلیم آپ کا اپنا فرض ہے۔ چونکہ سرمایہ داری میں تجارتی قدریں فروغ پاتی ہیں اس لیے تعلیم کو بھی ایک سودا (Comodity) بنا کر منافع کمانے کی غرض سے فروخت کیا جاتا ہے۔ تعلیم کو چند لوگوں کی پہنچ میں رکھ کر بہت بڑی اکثریت کی جہالت کو ان کی اپنی سستی بد نیتی اور کاہلی کا نتیجہ قرار دیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس سوشلسٹ جمہوریت کا سیاسی نظریہ ہے کہ معاشرے میں طبقات انسان کے اپنے پیدا کردہ ہیں۔ جب تک معاشرے کو غیر طبقاتی نہیں بنایا جاتا تب تک انسانوں کے درمیان سیاسی برابری کا سوچنا خود فریبی ہے۔ چند لوگوں کو امیر ترین رکھنے کے لیے بڑی اکثریت کو غریب اور مفلوک الحال رکھنا بے انصافی ہے۔ معاشرے کو غیر طبقاتی بنانے کے لیے قدرتی وسائل جیسے کانوں سے نکلنے والی معدنیات پر چند لوگوں کی بجائے پوری آبادی کا حق ہے۔ لاکھوں مزدوروں کی محنت کی پیداوار کا منافع اکٹھا ہو کر ایک شخص کی جیب میں جانے کی بجائے پوری آبادی کی فلاح و بہبود پر خرچ ہو۔ سوشلسٹ ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وہ پوری آبادی کی بنیادی ضروریات پوری کرے۔ سوشلسٹ ریاست عام آدمی کی خدمت گار ریاست ہوتی ہے۔ یہ سیاسی نظریہ اپنی کوکھ سے جنم دینے والے تعلیمی نظریہ میں اس طرح منعکس ہوتا ہے کہ ریاست اپنی پوری آبادی کو تعلیم دینے کی ذمہ دار ہے۔ ہر شخص کو اس کی صلاحیتوں اور فطری رجحانات کے مطابق تعلیم دینا اور تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد اسے

Sanjh Lok Raj

پیداواری عمل میں شامل کرنا ریاست کا بنیادی فریضہ ہے۔ ایسی تعلیم جو ہر انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما کرنے والی۔ پیدواری عمل کو آگے بڑھا کر انسانوں کے لیے سہولتیں مہیا کرنے والی۔ بنیادی انسانی حقوق کی محافظ اور عالمی امن کے فروغ کو بڑھانے والی ہو۔

سیاسی نظام کی قدریں ایک طرف تو تعلیمی نظام میں منعکس ہوتی ہیں تو دوسری طرف یہ تعلیمی نظام اپنے پیدا کرنے والے سیاسی نظام کو مضبوط اور مستحکم بناتا ہے۔ طبقاتی نظام تعلیم طبقاتی معاشرے کو استحکام بخشتا ہے غیر طبقاتی نظام تعلیم غیر طبقاتی قدروں کو فروغ دیتا ہے۔ اگر آپ یہ چاہیں کہ معاشرہ تو ویسے کا ویسے طبقاتی ہی رہے اور اس کا تعلیمی نظام غیر طبقاتی ہو جائے جیسا کہ مسلم لیگ (ن) تحریک انصاف اور جماعت اسلامی کا منشور ہے تو یہ ممکن نہیں۔ تعلیم کے نظام کو تبدیل کرنے کی جدوجہد ملک کے سارے نظام کو تبدیل کرنے کی جدوجہد کا لازمی حصہ ہے کیونکہ آپ کا تعلیمی نظریہ دراصل ایک سیاسی نظریئے کا جزو ہے یا یوں کہیے کہ آپ کا تعلیمی نظریہ ہی آپ کا سیاسی نظریہ بھی ہے۔

پوسٹ کالونیل ملکوں کی ریاست اور سیاست ویسی نہیں ہوتی جس طرح کی جدید ریاست کا نظریہ پولیٹکل سائنس میں پیش کیا جاتا ہے۔ پوسٹ کالونیل ریاست کو عالمی سرمایہ داری اور اندروں اسٹیلشمنٹ ملکر عدم استحکام کا شکار رکھتے ہیں۔ اور معاشی خود انحصاری کی طرف قدم نہیں بڑھانے دیتے اس طرح غیر مستحکم ریاست کو سامراج کی پناہ میں رہنے کا جواز مہیا کیا جاتا ہے۔ پوسٹ کالونیل ریاست میں سیاست بھی دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک سیاسی پارٹیوں کی اور دوسری فوجی سیاست۔ کالونیل دور میں چونکہ صرف وہی سیاسی پارٹیاں کام کر سکتی تھیں جن کی سیاست سے کالونیل انتظامی اور معاشی ڈھانچے کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔ پوسٹ کالونیل ریاستوں میں عالمی سرمایہ داری کے معاشی و سیاسی مقاصد کو فرمانبرداری سے آگے بڑھانے والے سیاستدانوں کو اقتدار تک لایا جاتا ہے۔ جہاں کہیں یہ سیاستدان عالمی سرمایہ داری کے پروگرام میں رکاوٹ بننے کی کوشش کریں انہیں ہٹا کر فوجی حکومتوں کے ذریعے اسی پروگرام کو آگے بڑھایا جاتا ہے۔ فوجی حکومتیں ہمیشہ سامراج کی عالمی سیاست کا آلہ کار رہتی ہیں۔

پوسٹ کالونیل ملکوں کی غیر مستحکم رکھی گئی حکومتیں ہر سال خسارے کا بجٹ پیش کرتی ہیں ان کے اخراجات آمدنی سے ہمیشہ زیادہ ہوتے ہیں۔ بجٹ کے اس خسارے کو پورا کرنے

Sanjh Lok Raj

کے لیے یہ ریاستیں عالمی مالیاتی اداروں سے قرض لیتی ہیں۔ ان قرضوں کے ساتھ صرف بجلی اور گیس کی قیمتیں بڑھانے ہی کی شرائط نہیں ہوتیں بلکہ پوری زندگی پر حاوی ایک جامع منصوبہ بندی ہوتی ہے جسے ساختی مطابقت پروگرام (Structural Adjustment Program) کہتے ہیں کہ آپ نے اپنے ملک کے اداروں کی اندرونی ساخت کو کس طرح سامراجی پالیسیوں کے مطابق بنانا ہے تعلیمی پالیسی اس پروگرام کا اہم حصہ ہوتی ہے۔ ہمارے ہاں جتنی بھی تعلیمی پالیسیاں نافذ ہوئی ہیں وہ عالمی بنک اور اس کے متعلقہ اداروں کی بنائی ہوئی ہیں۔ بس ہوتا یہ ہے کہ سیاسی حکومتیں ان پالیسیوں پر عملدرآمد کے لیے اپنے کسی رکن پارلیمنٹ کو وزیر تعلیم بنا دیتی ہیں جبکہ فوجی حکمران ریٹائرڈ فوجی جرنیلوں کو وزیر تعلیم بنا کر اس پروگرام کو آگے بڑھاتے ہیں۔ جنرل مشرف کے دور میں تو تمام یونیورسٹیوں کے وائس چانسلر بھی ریٹائرڈ فوجی جرنیل ہی تھے۔

ہمارے ملک کا کالونیل سیاسی ڈھانچہ جو ہمیں ورثہ میں ملا ہے اس ڈھانچہ میں سیاسی پارٹیوں کے ٹکٹ پر منتخب ہونے والے پارلیمنٹرین کا تعلق ان جاگیردار اور پیر گھرانوں سے ہوتا ہے جنھیں برطانوی حکومت نے 1857ء کی جنگ آزادی میں ان کی مدد کرنے پر جاگیروں سے نوازا تھا۔ پھر انہیں مقامی حاکم بنا کر کالونیل اقتدار کے محافظ کے طور پر سیاستدان بنایا تھا دوسری بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جنھیں فوجی حکومتوں نے مقامی بلدیاتی قیادت کے طور پر بھرتی کیا اور ترقی دیتے ہوئے انھیں قومی دھارے کی سیاست میں حصہ دار بنایا۔ بنکوں کے قرضوں، پلاٹوں اور لائسنسوں کی سیاسی رشوت سے انھیں دولت مند بنایا اور کالونیل جاگیرداروں کے شانہ بشانہ عالمی سرمایہ داری کے محافظ کے طور پر اقتدار میں شریک کیا۔

ہر پاکستانی کا تعلیم پر بنیادی حق منوانے اور تعلیم کی ذمہ داری ریاست پر ڈالنے اور سیاسی پارٹیوں کے منشور میں لکھے گئے تعلیمی پروگرام پر عملدرآمد کروانے کی جدوجہد پاکستان میں کالونیل جاگیردار قیادت، فوج کی بھرتی سے پیدا کیے گئے سیاستدانوں اور سٹرکچرل ایڈجسمنٹ پروگرام کے خاتمے کی جدوجہد ہی کا اہم حصہ ہے۔ یہ ایک سیاسی عمل ہے۔ لیکن ہم تو تعلیم کے لفظ کے ساتھ سیاست کا لفظ سننا پسند نہیں کرتے۔ اس کی وجہ ہمیں کالونیل تعلیمی ڈھانچے ہی میں تلاش کرنی پڑے گی۔

Sanjh Lok Raj

1947ء میں پاکستان کو جو تعلیمی ڈھانچہ ورثہ میں ملا وہ ان طریقوں اور قدروں پر مشتمل تھا جو برطانوی سامراج نے اپنے دور اقتدار میں تشکیل دیئے تھے۔کوئی حکمران یہ نہیں چاہتا کہ کوئی ایسی سوچ پیدا ہو جو ان کی حکمرانی کے محافظ سیاسی وسماجی ڈھانچے کو بدل دے۔ اس کے لیے لوگوں کو سیاسی طور پر جاہل رکھنا ضروری ہوتا ہے تاکہ وہ اپنے ساتھ ہونے والی بے انصافیوں کی وجوہات کو نہ سمجھ سکیں۔ وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ دولت اور وسائل چند لوگوں کے قبضے میں کیوں ہیں؟ وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ آدھی سے زیادہ آبادی غربت کے لائن سے نیچے زندگی کیوں گزار رہی ہے؟ وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ مائیں اپنے بچوں کو فروخت کرنے بازار میں کیوں لے آتی ہیں؟ وہ یہ نہ سمجھ سکیں کہ ظلم و جبر پر مبنی یہ نظام خدا نے نہیں خود انسان نے بنایا ہے۔اور وہ یہ بھی نہ سمجھ سکیں کہ یہ نظام تب تک قائم رہے گا جب تک لوگ اس نظام کے خاتمے کی سیاسی جدوجہد کا حصہ نہیں بنیں گے۔

جب انگریزوں نے ہندوستان میں تعلیم کا آغاز کیا تو اس بات کا اہتمام کیا گیا کہ تعلیم محض جامعہ معلومات کا مجموعہ ہو۔ زندگی سے لاتعلق ہو۔مظاہر کی مادی تشریح کرنے کی بجائے رونما ہونے والی تبدیلیوں کو مابعدالطبیعاتی وجوہات کا نتیجہ بتایا جائے۔تعلیم سے پیدا ہونے والا شعور نہ صرف غیر سیاسی ہو بلکہ سیاست سے نفرت کرتا ہو۔اس کا ایک ہی طریقہ ہے کہ تعلیم کے ذریعے لوگوں کو غیر سیاسی رکھا جائے۔لیکن ہندوستان میں ایک دوسرا طریقہ بھی اپنایا گیا کہ لوگوں کو غیر سیاسی بنانے کے لیے مذہب کے نام پر سیاست کو فروغ دیا جائے۔تاکہ مظلوم کسی ظالم کے سامنے صف آرا ہونے کی بجائے آپس میں ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہوں۔

اس سارے عمل کا نتیجہ یہ کہ آپ کو اردگرد بہت سے ایسے لوگ ملیں گے جو خود کو آپکا ہمدرد اور خیر خواہ ثابت کرنے کے لیے مشورہ دیں گے کہ سیاست سے دور رہو یہ کوئی اچھی چیز نہیں ہے۔ کچھ دوسرے لوگ یہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے کہ سیاست امیر لوگوں کا کھیل ہے۔فوجی حکومتوں کے حامی آپ کو یہ کہتے ہوئے پائے جائیں گے کہ ملک کو سیاست نے برباد کیا۔مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ آخرت کے امتحان کی تیاری کرو یہ دنیا چند روزہ ہے اس کو سنوارنے نہ بیٹھ جاؤ۔پارٹیوں کے ٹکٹ پر منتخب ہو کر آنے والے پیر دنیا سے اپنی بے نیازی ثابت کرنے کے لیے پارلیمنٹ میں جلوہ افروز ہی نہیں ہوں گے کیونکہ اقتدار ان کے

Sanjh Lok Raj

جوتوں کے نیچے ہے۔ اساتذہ بچوں کو سیاست سے دور رہنے کا درس دے کر ان کے مستقبل کو محفوظ بنانے کی کوشش کر رہے ہوتے ہیں۔ جاگیردار طبقہ بار بار وفاداریاں بدل کر سیاست کو منافقت ثابت کرنے میں زندگی صرف کر دیتا ہے۔ یہ سارا منظر نامہ کالونیل دور کی پیداوار ہے۔ جو پوسٹ کالونیل دور میں بھی جاری رکھا جاتا ہے۔ سیاسی اختلاف پر جیل، کوڑے، جائیداد کی ضبطی، کاروبار کی بربادی اور کیا کچھ نہیں کیا جاتا رہا۔ فوجی حکمران ملک کو سیاست سے ''پاک'' کرنے کا فریضہ سرانجام دیتے رہے اور فوجی حکمرانوں کی پیدا کی ہوتی قیادت ایک دوسرے کو دیکھ کر کہتی رہی کہ ان کا نام سن کر ہمارا خون کھولتا ہے۔

طلباء اور قوم کو غیر سیاسی رکھ کر مظلوم کو ظالم کے سامنے کھڑا کرنے کی بجائے مظلوم کو دوسرے مظلوموں کے خلاف صف آراء کیا جاتا رہا۔ سیاستدان بنانے کی نرسری یعنی طلباء تنظیموں پر انگریزوں نے نہیں۔ فوج نے نہیں بلکہ فوج کی پیداوار ایک سیاست دان نے پابندی عائد کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی سیاستدان کو (جو کہ بہت بڑی اکثریت سے کامیاب ہوا تھا) جرنیل نے ہتھکڑی لگا کر کال کوٹھڑی میں بند کر دیا تو اگلے دن اس کی حمایت میں کوئی بھی سڑک پر نہیں آیا۔

یہ شعور سیاسی تعلیم کی بخشش ہے کہ تعلیم کی ذمہ داری ریاست پر ہے جو تعلیم فرد کو سیاسی عمل کا حصہ دار نہیں بناتی وہ عالمی شہرت یافتہ ماہر تعلیم پولوفرائرے کے بقول ''غلامی کی مشق ہے'' سارا تعلیمی ڈھانچہ غلامی کی مشق کروانے کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ آج ہم ایک جدید نوآبادیاتی ریاست ہیں۔ بس اپنے ملک میں سے جدید نوآبادیاتی ڈھانچے کی محافظ پارٹیوں میں سے کسی ایک پارٹی کو چننے کا اختیار رکھتے ہیں۔ آج تعلیمی نظام میں جو تبدیلیاں کی جاتی ہیں وہ عالمی اداروں کی تجویز کردہ ہوتی ہیں۔ ملک کی ساری آبادی کو مفت اور لازمی تعلیم دلانے کا حق منوا کر انہیں پیداواری عمل کا حصہ بنا کر۔ پرامن، عدل وانصاف پر مبنی معاشرے کے قیام کا راستہ غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کی سیاسی جدوجہد سے ہو کر گزرتا ہے۔ خاص تعلیمی نظام کے حصول کی جدوجہد خاص سیاسی نظام کے نفاذ کی جدوجہد کا حصہ ہے۔

Sanjh Lok Raj

ہمارے تضادات

کرۂ ارض کے بہت بڑے حصے پر مسلمان بادشاہوں نے حکومت کی ہے اور بعض علاقوں پر تو ہزار سال تک حکومت کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کی ان فتوحات کو ہمیشہ غلبہ اسلام سے تعبیر کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن اگر آپ کسی عالم سے یہ پوچھ لیں کہ کیا بادشاہت اسلام کا سیاسی نظام ہے؟ تو کوئی بھی یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ بادشاہت اسلام کا سیاسی نظام ہے۔

ہندوستان پر مسلمان بادشاہوں کی ایک ہزار سالہ حکومت کو بھی غلبہ اسلام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے ہندوستان میں زوال کو مسلمانوں کا زوال کہا گیا اور اس کی وجہ یہ دریافت ہوئی کہ ہم دین سے دور ہو گئے تھے۔ اس وجہ کی دریافت کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ نوآبادیاتی قبضے سے آزادی حاصل کرنے کے لیے برصغیر کے مسلمانوں نے کئی بار مذہبی تحریکوں کا سہارا لیا۔ تحریک پاکستان بھی انہی تحریکوں کی ایک جدید ترقی یافتہ شکل تھی۔

تحریک پاکستان کے بارے میں تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ کیونکہ علامہ اقبال نے کہہ دیا تھا کہ سیاست کو مذہب سے الگ کر دیا جائے تو چنگیزی رہ جاتی ہے۔ تحریک پاکستان مذہب کے تابع ایک سیاسی تحریک تھی جبکہ دوسرے لوگ یہ کہتے ہیں کہ مذہب کا سیاسی استعمال تھا۔ یہ دونوں باتیں الگ الگ نہیں ہیں نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے۔ اب ذرا ہم یہ سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں کہ سیاست کیا ہوتی ہے؟ اور اگر وہ مذہب کے تابع ہو تو کیسی ہو جاتی ہے؟

سیاست کا موضوع ہے کہ فرد، افراد اور معاشرے اپنے فیصلے کرنے میں کس حد تک با اختیار ہیں اور کس حد تک با اختیار بنائے جا سکتے ہیں؟ کس معاشرے کو کس طرح چلایا جا رہا ہے؟ قدرتی وسائل اور ذرائع پیداوار کس طبقے کے قبضے میں ہیں اور کیوں؟ کیا لوگ اپنی زندگی کے بارے میں فیصلے کرنے کا حق رکھتے ہیں یا چند دوسرے لوگوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ

Sanjh Lok Raj

کروڑوں لوگوں کے بارے میں فیصلہ کریں کہ انہوں نے زندگی کیسے گزارنی ہے؟ سیاست ایک ایسا عمل ہے جس میں اجتماعی، بہبود کے پروگرام کو اپنی زندگی کے تجربے اور دیگر معاشروں کے تجربوں سے نکھارا جاتا ہے۔ جدید ریاست جس کی بنیاد جمہوریت پر رکھی ہے اس کا ہر شہری کسی بھی قسم کے سیاسی و مذہبی خیالات رکھنے کا حق رکھتا ہے اور ہر دوسرے شہری کے دوسری قسم کے سیاسی و مذہبی خیالات رکھنے کے حق کا احترام کرتا ہے۔

سیاست میں ہر ایک کے لیے ہر وقت اختلاف کرنے کی گنجائش موجود رہتی ہے اور سیاسی عمل تنقید سے آگے بڑھتا رہتا ہے۔ جبکہ مذہب میں اختلاف کی گنجائش نہیں ہوتی۔ مذہب میں اختلاف رائے کا حل دلیل نہیں تلوار ہوتی ہے۔ مذہب سے اختلاف کرنے والا کافر ہوتا ہے۔ اگر سیاست مذہب کے تابع ہو تو سیاسی اختلاف کو مذہب کے خلاف سازش سمجھ کر کفر قرار دے دیا جاتا ہے۔ اسی لیے تحریک پاکستان میں نعرہ لگایا گیا کہ ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ'' اور جو مسلم لیگ میں نہیں آیا وہ کافر قرار پایا۔ آج بھی جو لوگ تحریک پاکستان میں بنائی گئی مسلم قومیت کے نظریئے سے متفق نہیں وہ بھی یا تو کافر ہیں یا ہندوؤں کے ایجنٹ۔ سیاست برداشت سکھاتی ہے جبکہ مذہب کے تابع سیاست عدم برداشت کو جنم دیتی ہے۔ پاکستان کے مذہبی دانشوروں نے ضیاء الحق کے دور میں کافر کو تبدیل کر کے اس کی جگہ سیکولرازم کا لفظ استعمال کرنا شروع کر دیا تھا۔

67 سال گزرنے کے بعد ابھی یہ فیصلہ نہیں ہو سکا کہ قائداعظم پاکستان کو اسلامی مملکت بنانا چاہتے تھے یا جمہوریہ؟ ملک میں اسلامی نظام کے حامی قائداعظم کی تقریروں سے ایسے اقتباسات پیش کرتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم پاکستان کو اسلام کی تجربہ گاہ اور قرآن کریم کو اس مملکت کے دستور و قانون کا ماخذ قرار دیتے تھے۔ ترقی پسند خیالات رکھنے والے لوگ قائداعظم کی تقریروں سے کچھ ایسے اقتباسات پیش کرتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائداعظم کے خیال میں ہر شہری اپنے عقیدے سے راہنمائی حاصل کرنے کا حق رکھتا ہے۔ مگر دوسروں کو پابند نہیں کر سکتا کہ وہ بھی اسی کے عقیدے سے راہنمائی حاصل کریں بلکہ وہ بھی اپنے اپنے عقیدے سے راہنمائی حاصل کرنے کا حق رکھتے ہیں وہ امور مملکت کو جدید سیاسی و جمہوری خطوط پر چلانے کے حق میں تھے۔ دونوں دھڑے ایک دوسرے کو قائداعظم

سے متعلق اپنے وژن کا حامی بنانا چاہتے ہیں یہ کوئی نہیں کہتا کہ قائداعظم خود متضاد خیالات کے مالک تھے اور یہ تضاد سیاست کو مذہب کے تابع کرنے سے پیدا ہونا ہی تھا۔

پاکستان کو قائم ہوتے ہی جس تضاد کا سامنا تھا وہ یہ کہ ایک طرف تو اسے جدید فلاحی ریاست بننا تھا۔ اور جدید ریاست یقیناً جدید سیاسی و جمہوری اصولوں پر قائم ہوتی ہے۔ جدید ریاست کے ادارے جو انسان نے بادشاہتوں کے خاتمے پر اپنی زندگی کے فیصلے خود کرنے کے لیے خود تشکیل دیئے تھے وہ ہزاروں سال میں انسانی زندگی کے تجربوں سے اخذ کیے گئے سماجی علوم کا نتیجہ تھے۔ ہر وہ چیز جو انسان نے انسانیت کی بہتری کے لیے خود بنائی ہوتی ہے سیکولر کہلاتی ہے۔ جدید ریاست اور اس کے ادارے انسان نے بادشاہتوں کے متبادل تشکیل دیئے تھے اس لیے جدید ریاست ہوتی ہی سیکولر ہے۔

فلاحی ریاست وہ ریاست ہوتی ہے جس کی جملہ پالیسیاں اور ترقیات کا رخ عوام کی بہبود سے مربوط ہوتا ہے عوامی فلاح و بہبود تب تک ممکن نہیں جب تک کوئی ریاست معاشی لحاظ سے خود کفیل نہ ہو یعنی معاشی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑی نہ ہو۔ معاشی خود کفالت کے لیے نئی مملکت کو ایسا نظام تعلیم وضع کرنا تھا جو کالونیل غیر پیداواری تعلیمی ڈھانچے کی بجائے پیداواری ہوتا ملک کے خوشحال معاشی مستقبل کا ضامن ہوتا۔ بھیک مانگ کر فلاحی ریاست نہیں بنا کرتی۔ اس طرح جدید فلاحی ریاست کو جدید علوم کی ضرورت تھی۔

دوسری طرف قومی پہچان کی تشکیل کا مسئلہ تھا جو مذہب اور قدامت کے تصورات پر مبنی تھا۔ اس تضاد کو لے کر پاکستان میں تعلیم کا آغاز ہو رہا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بظاہر ہر حکومت نے ہی تعلیم کو اوّلیت دینے کے دعوے اور وعدے کیے لیکن ہر دور میں اس کے برعکس ہوا۔

قیام پاکستان کے چند ہی ماہ بعد نومبر 1947ء میں پہلی تعلیمی کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں وفاقی وزیر تعلیم فضل الرحمٰن نے قائداعظم کا پیغام پڑھ کر سنایا۔

''آپ حضرات کو تعلیم کی اہمیت کا بخوبی اندازہ ہے اس بات پر زیادہ زور دینے کی ضرورت نہیں کہ صحیح تعلیم کیا ہوتی ہے۔ سو سال سے زائد انگریزوں کے عہد حکمرانی میں حالات بھی کچھ ایسے تھے۔ مجھے افسوس ہے کہ اپنے لوگوں کی تعلیم پر قابل ذکر توجہ نہ دی جا سکی۔ اگر ہم حقیقی، تیز رفتار اور ٹھوس بنیادوں پر ترقی کے خواہاں ہیں تو ہمیں سنجیدگی سے

Sanjh Lok Raj

اس سوال کو لینا ہوگا۔تعلیم سے متعلق پالیسی اور پروگرام کو ایسے بنانا ہوگا جو نہ صرف لوگوں کی فہم، تاریخ اور ثقافت سے ہم آہنگ ہو بلکہ دنیا میں وقوع پذیر ہو چکے جدید حالات اور وسیع ترقی کو بھی مدنظر رکھے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ ہماری ریاست کے مستقبل کا دارومدار اس طرز تعلیم اور راستہ پر ہوگا جس پر ہم اپنے بچوں کی نشوونما کریں گے اور جس کی وجہ سے وہ پاکستان کے خدمت گزار بنیں گے۔

مستقبل کی معاشی ترقی کے لیے سائنسی اور تکنیکی تعلیم کے میدان میں ہمارے لوگوں کو تربیت دینے کی اشد ضرورت ہے۔ہمیں کامرس، تجارت اور خصوصاً منصوبہ بند صنعتی ترقی کو سائنسی علوم سے جوڑنا ہوگا۔

یہ بات مت بھولیں کہ ہمیں پوری دنیا سے مقابلہ کرنا ہے جو اس میدان میں پہلے ہی تیز رفتار ترقی کر رہی ہے میں دوبارہ سے زور دے کر کہوں گا کہ ہمیں تکنیکی اور ہنر سازی کی تعلیم پر خصوصی توجہ دینا ہوگی۔مختصر یہ ہمیں آنے والی نسلوں کی کردار سازی کرنی ہوگی۔اس کا مطلب ہے ان میں عزت نفس، دیانتداری، قوم کی از خود خدمت کرنے کا جذبہ، اور احساس ذمہ داری پیدا ہو۔ہمیں یہ دیکھنا ہوگا اس تربیت کی بدولت وہ معاشی طور پر مختلف شعبوں میں کردار ادا کرنے کی مکمل طور پر مہارت اور استطاعت رکھتے ہوں جس سے پاکستان کے وقار میں اضافہ ہو۔''

قائداعظم کی یہ تقریر کوئی جامع تعلیمی پالیسی نہیں تھی مگر اس میں بڑے واضح راہنما اصول موجود تھے جن کی بنیاد پر اگر

1 مناسب قانون سازی کی جاتی اور اس پر عملدرآمد کے لیے انتظامی ادارے بنائے جاتے جو اس قانون پر عملدرآمد کے لیے ضروری تھے۔

2 ان رہنما اصولوں کی روشنی میں جامع تعلیمی پالیسی بنائی جاتی اور ایسا نصاب ترتیب دیا جاتا جو بیان کیے مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنتا۔

3 اتنی رقم بجٹ میں مختص کی جاتی جس کے ذریعے تعلیم کا ہدف پورا ہوسکتا۔

مگر یہ تینوں کام نہیں ہوئے اور تقریر محض ایک خیال بن کر کتابوں میں محفوظ رہ گئی۔ یہ ایک سیاسی وژن تھا مگر قائداعظم کی مسلم لیگ تحریک پاکستان کے دوران اس کے لیے تیار

Sanjh Lok Raj

نہیں کی گئی تھی۔ کیونکہ مسلم لیگ کا اقتدار کالونیل جاگیرداروں کے ہاتھ میں تھا۔ تصورات کو غیر واضح اور دھندلا رکھ کر ہی ان کا اقتدار قائم رہ سکتا تھا۔

ان کے پاس اتنی صلاحیت موجود نہیں تھی کہ وہ تحریک پاکستان کے دوران کیے گئے وعدوں کو عملی شکل دے کر لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرتے وہ تو ہمیشہ سے بیوروکریسی پر انحصار کرنے کے عادی بنائے گئے تھے۔ ابتدائی چار ہی سالوں میں 1951ء تک بیوروکریسی پاکستان کے اقتدار پر اپنا قبضہ مکمل کر چکی تھی اور مسلم لیگ کے کالونیل جاگیرداران کے جونیئر پارٹنر کے طور پر اقتدار میں شریک تھے۔ بیوروکریسی کے برسر اقتدار آتے ہی تعلیمی پالیسی 1947ء میں تعلیم کو پیداواری نظام کے ساتھ جوڑنے کی پالیسی ختم کر کے اس کا رخ واپس کالونیل دور کی غیر پیداواری تعلیم کی طرف موڑ دیا۔ 5 دسمبر 1951 کو دوسری تعلیمی کانفرنس بلائی گئی اور 6 سالہ منصوبہ برائے تعلیمی ترقی (1951-195ء) تشکیل دیا گیا۔ جو سفارشات منظور ہوئیں ان کے الفاظ اور متن پر غور کرنا لازمی ہے۔

1 اردو کو مملکت خداداد پاکستان کی قومی وسرکاری زبان قرار دیا جائے۔
2 پاکستان کے تعلیمی نظام کو اسلامی نظریہ میں ڈھالا جائے۔
3 پرائمری سطح پر تمام سکولوں میں مادری زبانوں میں تعلیم دی جائے جبکہ سیکنڈری کی سطح پر پنجاب، بلوچستان، سرحد اور بہاولپور میں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔
4 ہم ایک ایسے تعلیمی نظام کی پیداوار ہیں جو خالصتاً مغربی اقدار پر مبنی ہے اور اس میں ہمارے مذہب اور ثقافت کو ملحوظ خاطر نہیں رکھا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا مذہب بارے علم محدود ہے۔ اور اب جب ہمیں پالیسی سازی کرتے ہوئے اسے عملی شکل دینی ہے تو خاصی مشکلات درپیش ہیں۔
5 ہم تعلیم کو ہوا میں نہیں چھوڑ سکتے بلکہ تعلیم کو اس نظریاتی تبدیلی کا آلہ کار سمجھتے ہیں جس کے لیے پاکستان بنایا گیا تھا۔
6 گوکہ پاکستان میں مخلوط تعلیم کے ادارے کام کر رہے ہیں تاہم خواتین کے لیے الگ تعلیمی ادارے بنانا ضروری ہیں۔
7 پرائیویٹ تعلیمی ادارے خصوصی طور پر اعلیٰ تعلیم کے ضمن میں گرانقدر خدمات

Sanjh Lok Raj

سرانجام دے رہے ہیں تاہم ایسا کرتے ہوئے انہیں بہت سی مالی مشکلات درپیش ہیں اورانھیں حکومتی امداد پر خاصا انحصار کرنا پڑتا ہے۔حکومت کو روزمرہ اخراجات کے علاوہ اُٹھنے والے خرچوں میں 50 فیصد حصہ ڈالنا چاہیے۔

8 پاکستان پہلے سے موجود بہت سی ریاستوں یا مملکتوں میں محض ایک اور ریاست بنانے کے لیےنہیں بنایا گیا بلکہ یہ اسلامی اصولوں پرمبنی طرز زندگی اپنانے کے لیے بنا ہے۔ یہ بات بہت دفعہ کی گئی مگر اس میں سب سے مستند آواز قرارداد مقاصد (1949ء) کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہیں۔

ان سطور کو پڑھتے وقت یہ بات دھیان میں رہے کہ جو رجحان ان سفارشات میں نظر آ رہا ہے وہ مقامی نہیں۔ 1949ء تک چین میں بھی سوشلسٹ انقلاب آ چکا تھا۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب قومی سرمایہ داریاں جنگی تباہ کاریوں کے بعد ڈھل کر عالمی سرمایہ داری میں ضم ہو چکی تھیں تو اب ان کے سامنے واحد خطرہ سوشلسٹ انقلاب کا تھا جو پوری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا تھا۔سوشلسٹ خیالات کو ایٹم بم یا میزائل سے تو نہیں روکا جا سکتا تھا اس کے مقابلے میں فکری مغالطوں کی دیواریں کھڑی کی جاتی تھیں۔ یہ سرد جنگ تھی اور اس جنگ کا میدان بارڈر نہیں تھے بلکہ یہ تعلیمی پالیسیوں، میڈیا، مذہبی بنیاد پرستی اور سٹرکچرل ایڈجسمنٹ پروگراموں کے ذریعے لڑی جاتی تھی۔ اس کا میدان عمومی طور پر پوری دنیا تو تھی ہی مگر خاص طور پر عرب اسرائیل اور جنوبی ایشیا زیادہ ساز گار تھے۔ مذہبی انتہا پسندی کا فروغ جدید خیالات کو روکنے کے لیے کیا جا رہا تھا۔سوشلزم کے معاشی انصاف اور عوامی جمہوریت کے سیاسی پروگرام کو مذاہب کو درپیش خطرہ ثابت کرنے کے لیے ہر مذہب کے اندر فکری محاذ قائم کیے جا رہے تھے۔انھیں رقم فراہم کی جا رہی تھی اور تعلیمی اداروں میں منظّم کیا جا رہا تھا۔

لہٰذا پوسٹ کالونیل ملکوں میں ہمیں جو سیاسی تبدیلیاں نظر آتی ہیں انھیں ہم کالونیل تعلیم کی ذہن سازی کی وجہ سے سمجھنے میں ناکام رہتے ہیں

Sanjh Lok Raj

پیداواری نظام تعلیم

سماجی سائنس کا یہ سادہ سا قانون جس کا جاننا ہر پڑھے لکھے شخص کے لیے ضروری ہے وہ یہ کہ معاشیات (پیداوار کے طریقے) وہ بنیاد ہے جس پر سماج کے باقی نظاموں کی عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ سیاسی نظام کی عمارت بھی معاشی نظام کی نبیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ معاشی بنیادوں کا نقشہ جیسا ہوگا اس پر کھڑی سیاسی عمارت کی شکل بھی ویسی ہی ہوگی۔ تعلیمی نظام اس سیاسی عمارت کا ایک پورشن ہے۔

چند سو سال پہلے پوری دنیا میں زراعت اور دستکاری کا دور تھا۔ زرعی معیشت کی بنیاد پر کھڑا سیاسی نظام بادشاہت تھی۔ بادشاہت ساری دنیا میں رائج تھی۔ زراعت اور دستکاری کے اس دور میں کائنات اور انسان کے بارے میں معلومات کی بنیاد چند عقلمند لوگوں کا قیاس تھا ان عقلمند لوگوں کے قیاس کی بنیاد پر حاصل کی گئی معلومات کو علم بذریعہ اتھارٹی کہتے ہیں۔ جس طرح آج بھی ہم کہتے یں کہ افلاطون نے کہا۔ ارسطو کا قول ہے وغیرہ۔

عالم باطن اور اس کے متعلق قیاسی معلومات کو مابعد الطبیعات کہا جاتا ہے۔ لیکن پاکستان میں پڑھائی جانے والی بی ایڈ اور ایم ایڈ کی کتابوں میں اسے علم الحقیقت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ باطنی عالم یا تصوراتی دنیا کو چونکہ افلاطون نے حقیقی دنیا قرار دیا ہے اس وجہ سے اس دنیا کے متعلق بنائے گئے خودساختہ تصورات اور قیاسات کو علم الحقیقت کا نام دیا گیا ہے۔ ظاہری دنیا کے متعلق مشاہدے سے حاصل کی گئی معلومات (سائنس) کو غلط، نظر کا فریب، گمراہ کن اور ذہن پر بوجھ قرار دیا گیا ہے۔

آدھی آبادی غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہی ہے ان کی وجوہات کو مابعدالطبیعات (پاکستانی علم الحقیقت) میں تلاش کرنا فلسفے کی زبان میں ماورائیت کہلاتا ہے۔

Sanjh Lok Raj

جن کے نزدیک مابعد الطبیعات کی قیاسی معلومات علم الحقیقت ٹھہریں ان کے نزدیک ماورائیت ہی دنیا کا آخری سچ ہے۔ اب چونکہ یہ بات افلاطون نے کہی تھی اس لیے سچ مانی جانے لگی۔ ایسی معلومات جو اس وجہ سے سچی مان لی جائیں کہ انہیں کسی ایسی شخصیت نے بیان کیا ہے جس کو علم پر اتھارٹی مان لیا گیا ہے یا ایسی معلومات جو کسی مقدس ہستی نے بیان کی ہیں جن کو نہ ماننے سے کفر لازم آتا ہے۔ ان کو علم بذریعہ اتھارٹی کہا جاتا ہے۔ وہ معلومات خواہ فلسفیوں کے ذریعے آتی ہوں یا بانیان مذاہب کی طرف سے علم بذریعہ اتھارٹی کہلاتی ہیں۔

علم بذریعہ اتھارٹی اور ماورائیت کو بادشاہت کے زمانے میں سرکاری سرپرستی اور بالادستی حاصل تھی۔ بادشاہ جو کوئی بھی ہوتا۔ جس کسی مذہب سے تعلق رکھتا۔ جس بھی خطے کا ہوتا وہ ہمیشہ اپنے اقتدار کو خدا کی طرف سے سونپا گیا بتاتا اور مذہبی پیشوا اس کی تائید کرتے۔ لوگوں کا کام تو بس خدا کے فیصلے کے سامنے سر جھکانا ہوتا۔ ماورائیت اقتدار تک ہی نہیں بلکہ زندگی میں رونما ہونے والے ہر واقعہ کا تجزیہ کرنے کے لیے بنیادی فلسفے کا کام دیتی تھی۔ بادشاہوں کی فتوحات کو لوگ اپنے اپنے مذہب کے خدا کی خوشنودی اور شکست کو خدا کی ناراضگی سے تعبیر کرتے۔

بارش، پیداوار میں اضافہ، عام لوگوں کی معاشی حالت میں بہتری یہ سب خدا کی اپنے بندوں سے خوش ہونے کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ زلزلے، بیماریاں، بھوک، غریب، آندھیاں طوفان، پیداوار میں کمی سب خدا کی ناراضگی کی علامتیں سمجھی جاتی تھیں۔ بادشاہ اور اس کے درباری مذہبی پیشوا ماورائیت کو کائنات کا آخری سچ بنا کر پیش کرتے۔ ماورائیت کے ہتھیار کے استعمال سے بادشاہ اپنی رعایا کی غربت دور کرنے۔ تعلیم دینے انھیں بیماریوں سے بچانے کی ہر ذمہ داری سے جان چھڑوا لیتا تھا۔

ماورائیت کے مطابق چونکہ اقتدار خدا نے دیا ہوتا تھا۔ اچھا بادشاہ خدا کی رحمت اور ظالم بادشاہ خدا کی طرف سے لوگوں کو ان کے اعمال کی سزا کے طور پر بھیجا گیا ہوتا تھا۔ اسلیے اس وقت کے لوگوں کو جو تعلیم دی جاتی تھی اس تعلیم کے مطابق بادشاہ سے بغاوت خدا کے فیصلے کے خلاف بغاوت بتائی جاتی تھی۔

فلسفے کی زبان میں جسے ماورائیت کہتے ہیں عملی زندگی میں وہ مذہب کہلاتا ہے خواہ

Sanjh Lok Raj

وہ دنیا کا کوئی بھی مذہب ہو۔ اس لحاظ سے بادشاہت کا دور مذہبی دور ہوتا ہے اس لیے نہیں کہ اس دور میں مذاہب کی شریعت نافذ ہوتی ہے بلکہ اس لیے کہ ظاہری دنیا میں رونما ہونے والے ہر واقعہ کے اسباب و وجوہات کو باطنی دنیا سے جڑا ہوا سمجھا جاتا ہے۔

ذہانت بھی خدا کی طرف سے عطا کردہ مانی جاتی تھی اس میں کسی انسان کی اپنی محنت اور لگن کا عمل دخل کم تھا۔ کوئی شخص اگر اپنی ذاتی کاوش اور ذاتی وسائل سے تعلیم حاصل کرتا بھی تھا تو یہ اس کی اضافی خوبی سمجھی جاتی تھی۔ جیسے زیور پہلے سے موجود خوبصورتی میں نکھار پیدا کرتا ہے اس طرح تعلیم بھی کسی انسان کی ذاتی خوبیوں میں نکھار پیدا کرنے کے لیے زیور سمجھی جاتی تھی۔ آج بھی آپ دیکھتے ہیں کہ سکولوں کے باہر لکھا ہوتا ہے ''تعلیم ایک ایسا زیور ہے جسے کوئی چوری نہیں کرسکتا۔''

تعلیم کے بارے میں نقطہ نظر میں تبدیلی کا دور صنعتی ترقی کا دور ہے جب دستکاری کی معیشت صنعت میں تبدیل ہوگئی۔ پیداوار میں کئی گنا اضافہ ہوگیا یہاں تک کہ زراعت کے طور طریقے بھی صنعتوں کے تابع ہو گئے۔ معیشت کا نظام تبدیل ہو جانے سے سیاسی ڈھانچہ بھی تبدیل ہونے لگا۔ بادشاہوں کو ہٹا کر لوگوں نے اپنے نمائندے منتخب کر کے پارلیمنٹ کا ادارہ تخلیق کرلیا۔ بادشاہ کے دربار میں فیصلے سننے کی بجائے عدلیہ کا ادارہ قائم کیا۔ قانون بھی لوگوں کے منتخب نمائندوں نے خود بنانا شروع کر دیئے اس عمل کا آغاز انقلاب فرانس سے ہوا۔

صنعتوں نے دو طبقوں کو جنم دیا۔ صنعت کار اور مزدور۔ دستکاری بھی بادشاہت کی طرح زیادہ تر موروثی تھی مگر صنعتوں نے سب کچھ بدل کے رکھ دیا۔ یہاں تک کہ روز مرہ استعمال کی اشیاء بھی اب صنعتی پیداوار بن گئیں۔ آپ ایک انڈے ہی کو لیجیے جو بظاہر کسی مشین نے پیدا نہیں کیا لیکن یہ لائیو سٹاک اور (Genetic Science) کے ذریعے پیدا کیا گیا ہے۔ گوشت کی ضروریات کو برائلر کی ایک نئی نسل ایجاد کر کے پورا کیا گیا ہے۔ آپ کے پاس موبائل ہے اسے بنانے کے لیے ایک خاص علم کی ضرورت ہے۔ موٹر سائیکل بنانے کے لیے الگ علم کی ضرورت ہے۔ کئی بار آپ کو دوائیوں سے بھرے میڈیکل سٹور پر جانے کا اتفاق ہوا ہوگا۔ ان دوائیوں کو بنانے کے لیے الگ علم کی ضرورت ہے جب کہ انھیں مختلف امراض کے علاج کے لیے استعمال کرنے کے لیے الگ علم کی ضرورت ہے۔ لہٰذا ہمارے استعمال میں جتنی

بھی چیزیں ہیں ہر چیز کے پیچھے ایک علم موجود ہے۔ جس کی وجہ سے چیزوں کی تخلیق عمل میں آئی۔ آج بھی صنعتی ادارے مصنوعات کو مزید ترقی یافتہ بنانے۔ نت نئی ایجادات سے زندگی کی بہتر سہولیات مہیا کرنے۔ امراض کو جاننے کے لیے میڈیکل آلات بنانے اور مشینوں کی پیداواری صلاحیت بڑھانے کے لیے تحقیق پر بھاری رقوم خرچ کرتے ہیں جس سے علم میں بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ اس طرح صنعتی دور کے آغاز ہی سے علم معاشرے کے پیدواری عمل سے جڑ گیا۔ یہ تعلیم پیداواری تعلیم کہلاتی ہے۔

جن چیزوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے یہ مادی پیداوار کہلاتی ہیں۔ انھیں بنانے اور استعمال کرنے کے لیے جس علم کی ضرورت ہے۔ اسے پیداواری تعلیم یا سائنس کہا جاتا ہے۔ لیکن مادی پیداوار کے علاوہ ایک اور پیداوار بھی ہے جس کا ذکر ہمارے جیسے معاشرے میں کم ہی ہوتا ہے وہ ہے سماجی پیداوار۔

اس کو ایک مثال سے سمجھتے ہیں۔ صنعتی پیدوار کی اندرون ملک یا بیرون ملک فروخت پر ٹیکس عائد کیا جاتا ہے۔ ٹیکس کی شرح مقرر کرنے اور ٹیکس اکٹھا کرنے کے لیے ایک ضابطہ قانون کی ضرورت ہے جو ٹیکس کی شرح، حد، وصولی کا طریقہ، نادہندہ کی سزا اور دیگر تفصیلات پر مبنی ہو۔ پھر اس ضابطے پر عملدر آمد کے لیے عملے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس طرح یہ ایک پورا نظام بن جاتا ہے جسے محکمے کی شکل میں منظّم کیا جاتا ہے۔ یہ محکمہ سماجی پیداوار ہے۔ سماج نے اپنی ضرورتوں کے پورا کرنے کے لیے اسے تخلیق کیا ہے۔ حکومت کے سارے محکمے۔ ریاست کے تمام ادارے اور خود ریاست سماجی پیداوار ہیں۔ جس طرح مادی پیداوار کے لیے سائنس اور ٹیکنالوجی کے علوم کی ضرورت ہے اسی طرح سماجی پیداوار کے لیے بھی علوم کی ضرورت ہے جیسے معاشیات سیاسیات اور تاریخ وغیرہ یہ علوم سماجی سائنس کہلاتے ہیں۔

لہٰذا سائنس اور سماجی سائنس دونوں پیداواری علوم ہیں۔ پیداواری علوم کو کسی اتھارٹی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ یہ تجربے اور مشاہدے سے ترقی کرتے رہتے ہیں ان کے صحیح یا غلط ہونے کا ٹیسٹ خود ان کی پیداوار ہے۔ ہر وہ چیز جو انسان نے تخلیق کی ہے وہ مادی ہو یا سماجی پیداوار سیکولر کہلاتی ہے۔ جیسے پیناڈول کی گولی انسان نے تخلیق کی ہے یہ گولی سیکولر ہے۔ ریفریجریٹر اور ائر کنڈیشنڈ انسان نے پیدا کیا ہیں یہ سیکولر چیزیں ہیں۔ اونٹ اور گھوڑا خدا

Sanjh Lok Raj

نے بنایا ہے تو موٹر سائیکل، ٹرین، جہاز اور راکٹ انسان نے تخلیق کیے ہیں اس لیے یہ سیکولر سواریاں ہیں۔ سماجی پیداوار میں ریاست انسان نے تخلیق کی ہے۔ عدلیہ انسان نے بنائی ہے اس کے قوانین انسان نے بنائے ہیں اس لیے یہ سیکولر ہیں۔

صنعتی پیداوار نے دنیا کے ممالک کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا 1۔ صنعتی ممالک، 2۔ کالونیاں یا منڈیاں۔ کسی ایک ملک کی صنعت نے جب اپنے ملک کی آبادی کی ضرورت سے زیادہ پیداوار کرنی شروع کر دی یا اس ملک کی پیداوار اس کی آبادی کی قوت خرید سے زائد تھی تو صنعتی ممالک کو بیرون ملک منڈیوں کی ضرورت پیش آتی ہے۔ دنیا کی 85 فیصد آبادی کے زرعی ممالک صنعت آنے سے پہلے ہی 15 فیصد آبادی کے صنعتی ممالک کے قبضے میں تھے مقبوضہ ممالک میں تعلیم کا رواج بھی انہی چند صنعتی قابض ملکوں نے ڈالا۔

ہندوستان کا جغرافیائی خطہ جو بنگلہ دیش۔ پاکستان اور بھارت پر مشتمل ہے برطانوی سامراج کے قبضے میں تھا۔ صنعتی انقلاب کے بعد برطانوی سامراج نے ہندوستان میں جو سیاسی ڈھانچہ مسلط کیا اسے کالونیل ڈھانچہ کہتے ہیں۔ غیر پیداواری نظام تعلیم اس کالونیل سیاسی ڈھانچے کا حصہ ہے۔ غیر پیداواری نظام تعلیم رائج کر کے برطانوی سامراج نے اپنے معاشی مفادات کو استحکام بخشا۔ اسے کالونیل تعلیمی ڈھانچہ کہتے ہیں۔

کالونیل معاشی مفادات کیا تھے؟ اس کے لحاظ سے ہندوستان میں کس طرح کی تعلیم متعارف کروائی گئی؟

1 ہندوستان کے جغرافیائی خطے کو زراعت پر جامد رکھا جائے تاکہ یہ خطہ خام مال پیدا کرے جسے ریل کے ذریعے ساحل سمندر تک پہنچایا جائے بحری جہازوں کے ذریعے برطانیہ بھیجا جا سکے اور ساحل سمندر سے برطانوی مصنوعات دور دراز کے زرعی علاقوں میں بھیجی جائیں۔

2 زراعت پر جامد رکھنے کے لیے جاگیردار طبقہ پیدا کیا گیا۔ انھیں اقتدار میں شامل کر کے سیاسی قوت بنا دیا گیا۔ بیوروکریسی کو قانون ساز ادارہ اور پولیس کو قانون نافذ کرنے والے محکمے کے طور پر متعارف کروایا گیا۔

3 اس خطے کو صنعتی ممالک کی مصنوعات کی مستقل منڈی رکھنے کے لیے غیر پیداواری

نظام تعلیم نافذ کیا گیا۔ جسے صارف نظام تعلیم بھی کہتے ہیں۔

ہم نے 1947ء میں نوآبادیاتی غلامی سے جدید نوآبادیاتی غلامی کے سفر کو آزادی کا نام دے دیا 66 سال گزرنے کے بعد بھی ہم پنسل، ربڑ، تالے اور کھلونوں تک چین سے خریدتے ہیں۔ صابن، سرف، آئس کریم تک ملٹی نیشنل کمپنیاں ہمارے گلی محلوں تک فراہم کرتی ہیں۔ زرعی ملک ہونے پر فخر کرنے والے ملک کی زراعت غیر ملکی کھادوں۔ غیر ملکی مشینری اور سپرے پر منحصر ہے۔ سر کے درد اور بخار کی گولی تک ریکٹ اینڈ کول میں ہمیں فراہم کرتے ہیں۔

ہمارے ملک میں بڑی بڑی انجینئرنگ یونیوسٹیاں، فارمیسی کے ڈیپارٹمنٹ اور سائنسی تحقیق کے ادارے موجود ہیں لیکن انڈا پیدا کرنے والی مرغی کا چوزہ برطانوی کمپنیاں فراہم کرتی ہیں۔ غیر پیداواری تعلیم کا کام صرف اور صرف غیر ملکی مصنوعات کی اندرون ملک کھپت بڑھانے کی راہ ہموار کرنا ہے۔ ہم ہر سال جتنی درآمدات کرتے ہیں ہماری برآمدات ان کا سوواں حصہ بھی نہیں۔ اس طرح ہمیں ہر سال بیرون ملک رقم کی نکاسی سے جو خسارہ ہوتا ہے وہ ہم قرض لے کر پورا کرتے ہیں۔ قرضے کے ساتھ شرائط آتی ہیں اسی کے ساتھ ہمیں تعلیمی پالیسیاں بھی دی جاتی ہیں جو ہمارے ملک میں نافذ ہوتی رہی ہیں۔ مقروض ممالک میں رہنے والے لوگوں کے مستقبل کے فیصلے قرض دینے والے ممالک کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اور ہماری محکومی و معاشی محتاجی کی وجہ غیر پیداواری نظام تعلیم ہے۔ دنیا میں رائج رہنے والے پیداواری اور غیر پیداواری نظام تعلیم کا خاکہ اس طرح ہے۔

انقلاب فرانس کے بعد سے دنیا کی بادشاہتیں اب جمہوری حکومتوں میں تبدیل ہونا شروع ہوگئی تھیں لیکن عالمی انسانی سماج کے ایک حصے نے ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ اب تک محنت کش اپنے طبقے کی نجات کے لیے سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی سیاسی پارٹیوں کے دلکش نعروں کے فریب میں تھے اور جمہوریت کے نام پر انھیں برسر اقتدار لاتے تھے۔ مگر اب محنت کش طبقے میں طبقاتی شعور بیدار ہو چکا تھا۔ محنت کشوں نے اپنے طبقے کو منظّم کیا۔ اپنے طبقے سے سیاسی قیادت اُبھاری اور غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کی جدوجہد شروع کر دی۔ جو بالآخر انقلاب روس اور چین کے سوشلسٹ انقلاب کی شکل میں کامیاب ہوئی۔ روس اور چین دونوں ہی دنیا کے پسماندہ ترین ملک تھے۔ مگر انھوں نے سوشلسٹ نظام تعلیم نافذ کیا اور چند

Sanjh Lok Raj

ہی سالوں میں سپر پاور بن گئے۔ پیداواری نظام تعلیم۔ پوری آبادی کو تعلیم دینا ریاست کی ذمہ داری۔ غیر طبقاتی نظام تعلیم۔ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں میں اضافہ کرنے کے لیے سماجی و سائنسی علوم۔ انسانیت کا احترام سکھانے والی روحانیت یہ ہیں وہ بنیادی اجزاء جن پر سوشلسٹ نظام تعلیم کھڑا کیا گیا۔

انسانی تاریخ میں تعلیمی نظاموں کو ہم ایک جدول کے ذریعے سمجھتے ہیں۔

نمبر	ممالک کی معاشی بنیاد	سیاسی عمارت	تعلیم کا ماخذ	تدریس کا ماڈل	تعلیم کی ذمہ داری	تعلیم کی حیثیت
1	زرعی/ دستکاری	بادشاہت	مذہب/ اتھارٹی	حاکمیتی	انفرادی	زیور غیر پیداواری
2	صنعتی	سرمایہ دارانہ جمہوریت	سائنس/ مشاہدہ	حاکمیتی	طبقاتی	پیداواری
3	کالونیل/ مقبوضہ ممالک	غیر ملکی حکمران	نیم سائنسی نیم مذہبی	حاکمتی	طبقاتی	غیر پیداواری
4	پوسٹ کالونیل زرعی	فوجی اور سول آمریت	مذہبی/ اتھارٹی	حاکمیتی	طبقاتی	غیر پیداواری
5	سوشلسٹ معیشت	عوامی جمہوریت	سائنس انسان دوست سماجیات	شراکتی	غیر طبقاتی	پیداواری

Sanjh Lok Raj

تعلیمی پالیسیاں(1)

سماجی علوم کے ماہرین نے سماج سے متعلق جو قوانین دریافت کیے ہیں اور جن قوانین کی دریافت کی وجہ سے سماجی علوم اب سماجی سائنس کا درجہ حاصل کر گئے ہیں ان میں سے ایک قانون تعلیمی نظام سے متعلق ہے۔ وہ یہ کہ کسی ملک کا تعلیمی نظام اس ملک کے سیاسی نظام کا لازمی جزو ہوتا ہے اور سیاسی نظام کی عمارت اس ملک کے معاشی نظام کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے۔ اس لیے کسی ملک کی تعلیمی پالیسیوں کا جائزہ لینے کے لیے اس ملک کے معاشی نظام پر نظر رکھنی چاہیے۔

جب پاکستان معرض وجود میں آیا تو پوری دنیا دو معاشی بلاکوں میں تقسیم تھی۔ سرمایہ دار صنعتی ممالک کا بلاک جو امریکہ کی سربراہی میں دوسری جنگ عظیم کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ دوسرا سوشلسٹ بلاک جو روس کی سربراہی میں وجود میں آیا۔ پاکستان کے اس دنیا میں وجود میں آنے تک سرمایہ دار صنعتی یورپی ممالک منڈیوں کی چھینا جھپٹی کے لیے دو عالمی جنگیں لڑ چکے تھے جس کی وجہ سے بہت بربادی ہو چکی تھی۔ اب امریکہ کی سربراہی میں سرمایہ داری کا عالمی روپ وجود میں آ چکا تھا۔ سرمایہ دار ممالک کے درمیان یہ طے پا گیا تھا کہ تیسری عالمی جنگ کو روکنے کا صرف ایک ہی طریقہ ہے وہ یہ کہ سابقہ کالونیوں کو آزاد کر دیا جائے اور منڈیوں کی تقسیم مذاکرات کی میز پر بیٹھ کر کی جائے۔ سابقہ کالونیوں میں ایک ملک کا اجارہ ختم کر کے دوسرے ممالک کو بھی ان ممالک میں اپنی مصنوعات بیچنے کی آزادی ہو۔

اس طرح کسی سرمایہ دار ملک کی مقبوضہ منڈی میں ایک قابض ملک کا اجارہ ختم کر کے دوسرے صنعتی ممالک کو اپنا مال بیچنے کی آزادی حاصل ہونے کو اس ملک کی قومی آزادی سے تعبیر کیا گیا۔ یہ آزادی پاکستان کو بھی حاصل ہوئی۔ جس کو ہم نے قومی آزادی

Sanjh Lok Raj

سے موسوم کیا اس عمل کو پولیٹکل اکانومی کی اصطلاح میں جدید نوآبادیاتی نظام کہتے ہیں۔

منڈیوں کی میز پر تقسیم اور اس تقسیم پر امریکہ کی ثالثی تسلیم کر لینے کے بعد سرمایہ دار صنعتی ممالک کو اب آپس میں ایک دوسرے سے تو کوئی خطرہ نہیں رہا تھا۔ انھیں اگر کوئی خطرہ نظر آ رہا تھا تو وہ سوشلسٹ بلاک سے۔ کیونکہ سوشلسٹ آئیڈیالوجی کا جنم لینا ہی سرمایہ داری استحصالی نظام کے خاتمے کا اعلان تھا۔ امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے ختم ہو جانے کے کئی دن بعد جاپان پر ایٹم بم پھینک دیا تھا۔ مگر یہ حربہ سوشلسٹ بلاک پر کامیاب نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ روس کے پاس بھی کئی ایٹم بم موجود تھے ایسا کرنے سے نیوکلیئر جنگ کے شروع ہو جانے کا خطرہ تھا۔

اس لیے ایک انوکھی قسم کی جنگ کی حکمت عملی تیار کی گئی۔ یہ جنگ اسلحہ اور بارود سے نہیں لڑی جانی تھیں بلکہ یہ لڑائی روس کی معاشی ناکہ بندی کر کے اور پوسٹ کالونیل ملکوں کی صنعتی ترقی کو جبراً روک کر انہیں زراعت پر جامد رکھ کر لڑی جانی تھی۔ اس کو سرد جنگ کا نام دیا گیا۔ پوسٹ کالونیل ملک اس جنگ کا محاذ تھے اور ان ملکوں کی تعلیمی پالیسیاں اس جنگ کا ہتھیار۔

سماجیات کے عالمی شہرت یافتہ پروفیسر حمزہ علوی نے دوسری جنگ عظیم کے بعد کی سرمایہ دار دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ان کے نزدیک (1) صنعتی مراکز Industrial Centres اور دوسرے (2) منڈیاں یا مضافاتی ریاستیں (Peripheral States) ہیں۔ پاکستان کو وہ مضافاتی ریاست کا بہترین نمونہ قرار دیتے ہیں۔ مضافاتی ریاستوں کی معاشی، انتظامی اور سیاسی ساخت چونکہ سامراجی مفادات کی مطابقت میں تعمیر کی گئی تھی اس لیے ان ملکوں کی معیشت کو سامراجی قرضوں پر منحصر کر کے سرد جنگ کے لیے امریکی دفاعی معاہدوں کا شریک بنانا آسان تھا لہٰذا ان ملکوں کو سرد جنگ کے اگلے مورچے کے طور پر استعمال کیا جانا طے پایا۔ یہ سب کچھ تو خیر فوج۔ بیوروکریسی اور سیاسی پارٹیوں کے جاگیرداری ڈھانچے نے کرنا تھا۔

مضافاتی ریاستوں میں عالمی سرمایہ داری کو سب سے بڑا خطرہ ان ملکوں کو صنعتی ترقی پر گامزن ہو جانا تھا۔ کیونکہ مضافاتی ریاستیں اگر خود صنعتی مراکز بننے کی کوشش میں مصروف ہو جاتیں تو سرمایہ دار ممالک کی منڈیاں سکڑ جاتیں۔ سرمایہ دار ملکوں کی منڈیاں سکڑنے کا

Sanjh Lok Raj

مطلب یہ تھا کہ ان ملکوں میں طبقاتی تحریکیں زور پکڑ جاتیں۔ مضافاتی ریاستوں کو صنعتی ترقی کی راہ پر نہ چلنے دینے زراعت پر جامد رکھ کر جاگیرداری ڈھانچے رکھنے والی سیاسی پارٹیوں کو اقتدار میں بنائے رکھنے اور کروڑوں عوام کو عالمی سرمایہ داری کے مفادات کی اطاعت میں زندگی گزارنے پر مجبور رکھنے والے کالونیل نظام کا کوڈ ان ملکوں کی تعلیمی پالیسیوں میں رکھا گیا۔ پاکستان کے لیے یہ تعلیمی پالیسیاں ہمیشہ عالمی بنک کے ماہرین اور مقامی بیوروکریسی کی معاونت سے بنائی جاتی رہیں۔

نو آبادیاتی تعلیمی ڈھانچے کے کوڈ پر تفصیلی گفتگو کرنے سے پہلے ہم مضافاتی ریاستوں میں تعلیم پر خرچ کی جانے والی رقم سے ان ملکوں میں تعلیم کی حیثیت کا اندازہ لگاتے ہیں۔ پروفیسر سیّد محمد نصیر کے مطابق اس وقت سب سے زیادہ شرح ناخواندگی یعنی 62 فیصد پاکستان میں ہے (UNDP Human development reoprt 2000) ڈاکٹر محبوب الحق کے مطابق ''اگر دفاعی اخراجات صرف ایک سال کے لیے منجمد کر دیئے جائیں تو پورے ملک میں ہر بچے کو ابتدائی تعلیم دینے کے اخراجات نکل آئیں گے۔'' محبوب الحق کی کتاب (Human development in Sout Asia)

ممالک	کل قومی آمدنی میں تعلیم اور دفاع کا حصہ فیصد		حکومتی اخراجات اور دفاع کا حصہ فیصد	
1997	تعلیم	دفاع	تعلیم	دفاع
بنگلہ دیش	2.2	1.4	16.2	10.7
ہندوستان	3.2	2.8	11.6	14.3
نیپال	3.2	.8	13.5	5.8
پاکستان	2.3	5.7	7.1	24.2
سری لنکا	3.4	5.1	8.9	21.2

یہ اعداد وشمار خود کہانی سناتے ہیں کہ جنوبی ایشیا میں کل قومی آمدنی (G.N.P) کا حصہ اور سرکاری اخرابات کا حصہ تعلیم پر سب سے کم اور دفاع پر سب سے زیادہ رہا۔ بنگلہ دیش

Sanjh Lok Raj

میں تعلیم پر حکومت اپنی آمدنی کا 16.2 فیصد خرچ کرتی ہے اور ہم 7.1 بنگلہ دیش کے آدھے سے بھی تھوڑا۔

یہ تو ہیں تعلیم پر خرچ ہونے والے مصارف جن کی شرح 1947ء سے آج تک کم و بیش دو فیصد کے ارد گرد رہی۔ پاکستان کی اسٹیبلشمنٹ اور اس کی پیدا کی ہوئی سیاسی قیادت جس نے قرار داد و مقاصد کو ہمیشہ ایک صحیفے کا درجہ دیا ہے اور ضیاء الحق نے جس کو آئین کا جزو بنا دیا تھا اس صحیفے میں تعلیم کا ذکر تک بھی نہیں ملتا۔1972 کی تعلیمی پالیسی کے علاوہ کوئی بھی تعلیمی پالیسی کسی عوامی مطالبے کے نتیجے میں وجود میں نہیں آئی۔ کیونکہ یہ زمانہ پاکستان سمیت دنیا کے بیشتر ممالک میں سوشلزم کے اُبھار کا زمانہ تھا اس لیے تعلیم کے سوشلسٹ نظریئے کی ایک جھلک پیپلز پارٹی حکومت نے دکھائی اور

''یکم اکتوبر 1972ء سے پہلی کلاس تا آٹھویں کلاس سرکاری و پرائیویٹ سکولوں میں تعلیم مفت کر دی گئی۔ پاکستان کی سرزمین پر پیدا ہونے والا کوئی بچہ تعلیم سے محروم نہ رہے بچوں کے لیے یہ ہدف 1979ء اور بچیوں کے لیے 1984 مقرر کیا گیا۔ مرحلہ وار پروگرام میں نصابی کتب۔ کاپیاں اور تعلیمی ضروریات کی دیگر اشیاء مفت فراہم کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور نئے کلاس روم۔سکول تعمیر کرنے کے لیے بجٹ مختص کیا گیا۔''

اب آیئے اس کوڈ کی طرف جو عالمی مالیاتی اداروں اور مقامی بیوروکریسی کے تعاون سے بنائی گئی تعلیمی پالیسیوں کے ذریعے پاکستان کی نوجوان نسلوں کے دماغ کو لگایا جاتا ہے۔جس کوڈ کی وجہ سے سامراج کی معاشی غلامی سے نجات کا خواب محض خام خیالی بن کے رہ گیا۔

وہ کوڈ ہے''تعلیم غیر پیداواری ہو اور معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کا آلہ ہو''ہم اس کوڈ کو آسانی کے لیے دو حصوں میں تقسیم کر کے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

(1) تعلیم غیر پیداواری ہو

پاکستان کے ہر شہر میں چند سرکاری سکول، بہت سے مہنگی فیسوں والے مقامی مالکان کے پرائیویٹ سکول۔ اکا دُکا سرکاری کالج، کئی کئی گروپ آف کالجز کے فرنچائز سکول اور کالج۔ انجینئرنگ یونیورسٹیاں، سرکاری اور پرائیویٹ یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ لندن اور امریکہ کے

کالجوں، یونیورسٹیوں کے نام پر رکھے گئے کئی پرائیویٹ کالج اور یونیورسٹیاں اور فارمیسی کے تعلیمی ادارے موجود ہیں۔ان تعلیمی اداروں کی تعداد اب لاکھوں کی حد کو چھو رہی ہے۔

لیکن ملک کی پیداواری صلاحیت میں ان کا حصہ جاننے کے لیے آپ کو کسی گوشوارے یا اعداد وشمار کی ضرورت نہیں آپ اپنی زیر استعمال چیزوں سے اس کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہیں۔

a بچوں کے کھلونے (چین) سلانٹی اور پاپڑ (امریکہ) ٹافیاں (سوئٹزرلینڈ) بسکٹ (فرانس) اور فیڈر (کوریا) پنسل ربڑ (چین) مارکر (جاپان)

b گھریلو استعمال کے صابن سرف (برطانیہ) ٹوتھ پیسٹ (جرمنی) پانی اور دودھ (آسٹریلیا) انڈہ برائلر (برطانیہ) ریفریجریٹر (جاپان) ٹی وی (جاپان) ٹائر (کوریا)

c انفرادی استعمال کی چیزیں موبائل، موٹر سائیکل، کار (چین، جاپان، کوریا)

d زرعی آلات، ٹریکٹر (اٹلی) ہارویسٹر (ہالینڈ) کھادیں کیڑے مار ادویات (امریکہ)

یہ اور ان کے علاوہ بہت سی چیزیں یا مصنوعات جن سے ہماری گلی کے کونے پر موجود کھوکھے سے لے کر بڑی بڑی مارکیٹیں بھری پڑی ہیں سب کی سب غیر ملکی مصنوعات ہیں۔انہیں درآمدات کہتے ہیں۔

جس ملک کی درآمدات بہت زیادہ ہوں جیسے کہ ہمارے ملک کی۔ہمیں جوتے کی پالش اور سر درد کی گولی بھی غیر ملکی کمپنیوں کی لینی پڑتی ہیں ایسے ملک کے پاس اپنی آمدنی کا کوئی ذریعہ نہیں ہوتا کہ درآمدات کے ذریعے جتنا پیسہ باہر بھیجا ہے اپنی مصنوعات بیچ کر اتنا پیسہ واپس منگوالیں۔ایسے ممالک کو اپنی معیشت کو زندہ رکھنے کے لیے امریکی قرضوں پر انحصار کرنا پڑتا ہے۔قرضوں کے ساتھ شرائط اور پروگرام آتے ہیں جن کو (Structural Adjustment Programmes) کہتے ہیں۔جن میں معاشی منصوبہ بندی اور تعلیمی پالیسیاں بھی ہوتی ہیں۔

پاکستان کے سامری معیشت دان اور وزیر خزانہ اسحاق ڈار نے اپنی بجٹ تقریر میں یہ تو بتایا ہے کہ پاکستان کی 55 فیصد آبادی غربت کی لائن سے نیچے زندگی گزار رہی ہے۔مگر یہ نہیں بتایا کہ اس کی وجہ غیر پیداواری نظام تعلیم ہے۔اگر ہم اپنے روز مرہ کے استعمال کی

Sanjh Lok Raj

چیزیں اپنے ملک میں بنا رہے ہوتے تو ہماری تعلیم اس پیداواری عمل کا حصہ ہوتی۔ لوگوں کو روزگار ملتا اور جو دولت ان چیزوں کی خریداری میں بیرون ممالک منتقل ہو جاتی ہے وہ اندرون ملک مزید انوسٹمنٹ کر کے مزید پیداوار اور روزگار کے مواقع پیدا کرنے کے کام آتی۔ مگر ہماری تعلیم بھی صارفوں کے لیے بنائی گئی تعلیم بن کر رہ گئی ہے۔

غیر پیداواری نظام تعلیم کے ذریعے معیشت کو سامراجی قرضوں پر منحصر رکھ کر کشکول توڑ دینے کی باتیں اپنے ہی گھر کی طرف منہ کر کے بڑھکیں مارنے کے سوا کچھ نہیں۔ ایسی معیشت کو قائم رکھنے کے لیے عالمی سرمایہ داری اور ریاست پر قابض طبقے سیاسی ڈھانچے کو غیر مستحکم رکھتے ہیں۔ عالمی سطح پر عالمی سرمایہ داری کے محافظ دستوں کا کردار ادا کرنے والے طبقوں کو ہی پوسٹ کالونیل ریاستوں کا حکمران بنایا جاتا ہے۔

پاکستان کا سیاسی ڈھانچہ ہے کیا؟ معیشت کو زراعت پر جامد رکھنے کے لیے انگریزوں کے پیدا کئے گئے جاگیردار۔ غیر پیداواری نظام تعلیم کی محافظ بیوروکریسی۔ پاکستانی ریاست کی سرپرستی میں معاف کیے گئے قرضوں سے بنائے گئے جدید نوآبادیاتی نظام کے محافظ گماشتہ سرمایہ دار۔ جاگیردار کلچر اور خاندانی بادشاہت پر مبنی سیاسی پارٹیاں۔ ان تمام اداروں پر فوج کی حفاظتی نگرانی۔ مارشل لاؤں کے ذریعے غیر سیاسی بنانے والی تعلیم اور مذہبی انتہا پسندی کے فروغ کے ذریعے پیدا کیا گیا غیر سیاسی معاشرہ۔ یہ ہے ہماری معیشت کا بالائی ڈھانچہ۔ کالونیل نظام کی محافظ سیاسی پارٹیاں اس بالائی ڈھانچے کو سدھارنے کی باتیں کرتی رہتی ہیں۔ مشہور دانشور اور ماہر تعلیم پروفیسر سیّد محمد نصیر پوچھتے ہیں کہ بالائی عمارت تو بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے اور جب اندر سے بنیاد ٹوٹ پھوٹ رہی ہو تو پھر خالی مرمت سے کیسے کام چلے گا؟

ہم اس کوڈ کی طرف آتے ہیں کہ تعلیم غیر پیداواری ہو اور معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کے کام آئے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ منڈیوں یا پیریفرل ریاستوں کے طالب علم بھی سائنس اور سماجی سائنس کی کم وبیش وہی کتابیں پڑھتے ہیں جو صنعتی ممالک کے طالب علموں کو پڑھائی جاتی ہیں۔ پھر کونسی ایسی چیز ہے کہ وہی علم ایک ملک کے طلباء میں پیداواری صلاحیتیں پیدا کرتا ہے اور دوسرے ملک کو صارف بناتا ہے؟

اسی سوال کا جواب ہی کوڈ کھولنے کی طرف ہماری راہنمائی کرے گا۔

Sanjh Lok Raj

سائنس اور سماجی علوم کے درخت فلسفہ مادیت کی سرزمین میں پیدا ہوئے ہیں یعنی سائنس اور سماجی سائنس کے علوم کی جڑیں فلسفہ مادیت میں پیوست ہیں۔ اگر ان درختوں کی جڑیں کاٹ کر انہیں مابعد الطبیعات اور ماورائیت کی سرزمین میں لگایا جائے تو انھیں پھل لگنا تو درکنار یہ درخت زندہ ہی نہیں رہیں گے۔ پاکستان کی تعلیمی پالیسیوں میں تعلیم کو غیر پیداواری بنانے کے لیے یہی فارمولا استعمال کیا گیا ہے کہ سائنس اور سماجی سائنس کے علوم کو مابعدالطبیعات اور ماورائیت کے ماتحت رکھا جائے۔ اس مشکل بات کو سمجھنے کے لیے ہم پیداوای تعلیم کے مادیت اور ماورایت سے تعلق کو آسان بنانے کے لیے ایک مثال کے ذریعے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ مثال آپ کے سامنے ایک ایسے مقدمے کی شکل میں پیش کی جا رہی ہے جس میں آپ جج ہیں۔ آپ نے دونوں طرف کے وکلا کے دلائل سن کر فیصلہ کرنا ہے۔

دعویٰ یہ ہے کہ زیر مقدمہ زمین بہت کم پیداوار دیتی ہے۔ جبکہ کئی دوسری زمینیں کئی گنا زیادہ پیداوار دے رہی ہیں۔ زراعت کے عالمی اعداد و شمار کے مطابق پاکستانی پنجاب میں گندم کی فی ایکڑ اوسط پیداوار 45 من۔ ہندوستانی پنجاب میں گندم کی فی ایکٹر اوسط پیداوار 100 من امریکہ کی ریاستوں میں گندم کی فی ایکڑ اوسط پیداوار 200 من ہے۔ بحث یہ ہو رہی ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ زرخیزی کیا ہوتی ہے اور زرخیزی کو کیسے بڑھایا جا سکتا ہے؟

جج: زمین کی زرخیزی کم ہونے کی وجہ آپ کے نزدیک کیا ہے؟ مدعی کی زمین میں پیداوار کیوں بہت تھوڑی ہے؟

وکیل فلسفہ مادیت: زرخیزی مختلف کیمیائی مادوں کا تناسب ہے۔ مدعی کی زمین میں کچھ کیمیکلز کی کمی ہے جن میں فاسفیٹ کی مقدار بہت کم ہے اس وجہ سے مدعی کی فصل کم ہوتی ہے۔

وکیل ماورائیت و مابعدالطبیعات: خدا کی ساری زمین ایک جیسی ہے۔ اس زمین کی پیدوار اس لیے کم ہے کہ زمین کے مالکان عشر ادا نہیں کرتے۔ یہ خدا کے قانون سے بغاوت ہے اور اس قانون سے بغاوت کی سزا کی وجہ سے اس کی پیداوار کم ہے۔

Sanjh Lok Raj

جج: زمین کی زرخیزی کو بڑھانے کا طریقہ کیا ہے تا کہ اس کی پیداوار کو بڑھا کر اس کے مالکان کی غربت تنگدستی کو دور کیا جائے۔

وکیل فلسفہ مادیت: اس کا حل یہ ہے کہ فاسفیٹ کو دیگر ذرائع سے حاصل کیا جائے اس کو پیداوار بڑھانے والے دیگر کیمکلز کے ساتھ ملا کر مصنوعی کھاد تیار کی جائے اور زمین میں ڈال دیا جائے اس طرح زمین کی پیداوار بڑھ جائے گی۔

وکیل ماورائیت و مابعدالطبیعات: اس کا حل یہ ہے جی کہ مالکان عشر بروقت اور پورا پورا ادا کریں اور سابقہ کئے کی معافی کے طلبگار ہوں۔ وقت پر بارش آئے گی۔ وقت پر ہوائیں چلیں گی اور اس کی پیداوار میں اضافہ ہو جائے گا۔

جج: آپ دونوں نے جو حل پیش کئے ہیں ان کے صحیح یا غلط ہونے کے جانچنے کا کیا طریقہ ہے؟ ہمیں کیسے پتہ چلے گا کہ کس کی طرف سے پیش کیا گیا حل درست ہے اور کس کا غلط۔

وکیل فلسفہ مادیت: میرے حل کا ٹیسٹ تجربہ ہے اگر مصنوعی طریقے سے بنائی گئی فاسفیٹ کی کھاد ڈالنے سے پیداوار بڑھ گئی تو میری طرف سے پیش کردہ حل درست ہوگا۔ اگر پھر بھی پیداوار میں اضافہ نہ ہوا تو ہم زمین کا دوبارہ تجزیہ کریں گے۔ بار بار کے عمل سے ٹیسٹ کریں گے۔ اپنی جدوجہد تب تک جاری رکھیں گے جب تک ہم پیداوار میں کئی گنا اضافہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے۔ بیج کی کوالٹی بہتر بنائیں گے۔ موسم کے پیداوار پر اثرات کا جائزہ لیں گے وغیرہ۔

وکیل ماورائیت و مابعدالطبیعات: یہ ہو ہی نہیں سکتا کہ عشر ادا کرنے پر پیداوار میں اضافہ نہ ہو۔ کیونکہ ایسا کرنے سے خدا کی قدرت حرکت میں آئے گی وقت پر بارش ہوگی دیگر عوامل بھی درست کام کریں گے۔ اگر آپ میرے پیش کئے ہوئے حل پر سوال اُٹھاتے ہیں یا اسے شک کی نگاہ سے دیکھتے ہیں تو یہ دراصل آپ کے ایمان کے کمزور ہونے کی نشانی ہے۔ ایمان کی

اس کمزوری کی وجہ سے امت مسلمہ زوال کا شکار ہے اپنا عقیدہ درست کرلو سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

آپ نے دونوں وکیلوں کے دلائل سن لیے۔ دونوں وکیلوں نے زمین کی زرخیزی کی الگ الگ وجوہات دریافت کیں اور پہچانی گئی ان وجوہات کی بنیاد پر اپنا اپنا حل پیش کیا۔ یہاں آپ نے یہ فیصلہ نہیں کرنا کہ کون درست ہے اور کون غلط بلکہ آپ نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ کس وکیل کے دلائل نے ایک نئے پیداواری عمل کو جنم دیا ہے۔ اور کس وکیل کے دلائل نے ایسا علم تخلیق کیا ہے جس کا پیداواری عمل سے کوئی تعلق نہیں۔

اب آپ کو سمجھ آ گئی ہو گی کہ سائنس کی وہی کتابیں یا سائنس کا وہی علم جو صنعتی مراکز ممالک میں مادیت کے تابع پیداواری عمل کو جنم دینے کا باعث بنتا ہے اسی علم کو ماورائیت اور مابعدالطبیعات کے تابع کر کے کس طرح غیر پیداواری بنا دیا جاتا ہے۔

2۔ تعلیم معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کے کام آئے

یہ کوڈ کا دوسرا حصہ ہے۔ سب سے پہلے تو ہم دیکھیں گے کہ سیاست کا تھیوریٹیکل تصور کیا ہے؟ پھر ہم یہ دیکھیں گے کہ سیاسی ہونے سے کیا مراد ہے؟ پھر یہ بھی دیکھیں گے کہ غیر سیاسی ہونا کیا ہے؟ معاشرے کو غیر سیاسی بنانے سے مقامی حکمران طبقوں اور ان کے ذریعے عالمی سرمایہ داری کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟ وہ کیا طریقے ہیں جن کے ذریعے معاشرے کو غیر سیاسی بنایا جاتا ہے۔

سیاست کا تھیوریٹیکل تصور

سیاست یہ جاننے کا نام ہے کہ آپ کے معاشرے کو کس طرح چلایا جا رہا ہے؟

یہ جاننا کہ آپ کے معاشرے میں کون کونسے طبقے موجود ہیں؟ قدرتی وسائل سے حاصل ہونے والی دولت کا رخ کس طبقے کی جیب کی طرف ہے؟ ذرائع پیداوار پر کون قابض ہے؟ ملک کی مجموعی پیداوار سے حاصل شدہ آمدنی چندلوگوں کی ملکیت ہے یا اجتماعی فلاح و بہبود کے کام آ رہی ہے۔ ملک کا معاشی نظام امیر کو امیر تر اور غریب کو غریب تر بنا کر غربت کی لائن سے نیچے تو نہیں دھکیل رہا۔ ملکیت کا معیار کیا ہے؟

Sanjh Lok Raj

یہ جاننا کہ عام لوگوں کو چند لوگوں کے حکم پر چلایا جا رہا ہے یا عام لوگوں کو اپنے فیصلے خود کرنے کا عادی بنایا جا رہا ہے۔ کیا پیداوار کے وسائل پر قابض طبقہ ہی ریاست پر بھی قابض ہے؟ ریاست پر قابض طبقہ کن ہتھکنڈوں سے اکثریتی طبقوں کو معاشی پسماندگی کا شکار رکھ کر انہیں سیاسی غلامی پر مجبور رکھتا ہے؟

سیاسی ہونا سماج کو تبدیل کرنے کے عمل کا حصہ دار بننا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ مغلیہ سلطنت کو بحال کرنا چاہتا ہے کیا یہ بھی سماج کی تبدیلی ہے اور کیا ایسی تبدیلی کا حصہ دار بننا بھی سیاسی ہونا ہے؟

جواب ہے نہیں۔ سماجی تبدیلی دراصل ملک کے معاشی نظام کو تبدیل کرنے کا نام ہے ایسا معاشی نظام جس میں ملک معاشی طور پر خود انحصار کرنے۔ زیادہ سے زیادہ آبادی کو روزگار مہیا کرنے کے لیے صنعت کاری۔ اجتماعی پیداوار اور قدرتی وسائل سے حاصل شدہ آمدنی کو پوری آبادی کی فلاح و بہبود کے لیے وقف کرنا۔ ہر شہری کی بنیادی ضروریات پوری کرنے کا ذمہ دار معاشی نظام کو بنانا۔ معاشی نظام کو اس قابل بنانا کہ ترقی کا عمل نیچے سے شروع ہو کر اوپر کی طرف جائے۔ سماجی تبدیلی کا عمل مستقبل کی طرف سفر کرنے کا عمل ہے۔ سماجی سائنس کے علماء سماجی تبدیلی کے قوانین دریافت کر چکے ہیں ان قوانین کے مطابق پسماندہ رکھے گئے عوام الناس اور محنت کش طبقات ہی منظّم ہو کر ایک پارٹی کے پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو کر اپنی طبقاتی قیادت کی رہنمائی میں سماجی تبدیلی کے عمل کو کامیابی سے ہمکنار کر سکتے ہیں۔

غیر سیاسی ہونا کیا ہے؟

یہ ماننا کہ معاشرہ جامد ہے۔ ہمیشہ سے ایسا ہے اور آئندہ بھی جوں کا توں رہے گا۔ یہ ماننا کہ تبدیلی نام کی کسی چیز کا دنیا میں وجود نہیں اگر کبھی کوئی تبدیلی رونما ہوتی بھی ہے تو وہ کسی معجزے کے نتیجے میں رونما ہوتی ہے۔ انسانی کوشش کا سماجی تبدیلی میں کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ ماننا کہ روز آخر تک کائنات میں جو کچھ ہونا ہے وہ روز اول ہی لکھ دیا گیا ہے۔ یہ ماننا کہ معاشرے کو ہزار یا دو ہزار سال پیچھے کی طرف لے جایا جا سکتا ہے۔ یہ ماننا کہ کائنات میں کوئی اصول یا ضابطہ کارفرما نہیں۔ چور اگر قطب بن سکتا ہے تو چور وزیراعظم کیوں نہیں بن سکتا؟

Sanjh Lok Raj

معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کے لیے پوسٹ کالونیل ملکوں میں فوجی حکومتوں کو لایا جاتا ہے جو طاقت کے استعمال سے سیاسی عمل کو ختم کر دیتی ہیں۔ سیاسی پارٹیوں کو منظّم نہیں ہونے دیا جاتا بلکہ ایک شخصیت کے وفاداروں کا ہجوم بنائے رکھا جاتا ہے۔ کاروباری لوگوں یا غیر سیاسی اشرافیہ سے قیادت اُبھار کر اس کے گرد لوگوں کا ہجوم اکٹھا کیا جاتا ہے۔ جو سیاست کی بجائے جذبہ وجنوں سے سرشار اپنے قائد پر جان نثار کرنے کو تیار رہتے ہیں۔لیکن معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کا اصل ہتھیار رسمی اور غیر رسمی تعلیم ہے۔

غیر رسمی تعلیم میں پیر، مذہبی تنظیمیں، الیکٹرانک میڈیا کے مذہبی چینل۔ دیگر چینلوں پر نشر کیے جانے والے قسمت کے حال اور استخارے کے پروگرام وغیرہ۔ جبکہ رسمی تعلیم میں معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کے لیے ارادی طور پر بنائی گئی تعلیمی پالیسیاں جن میں بنائے گئے نصاب کے ذریعے:

(ا) معاشرے کے عروج زوال کو مضحکہ خیز واقعات کے ذریعے ماورائی اسباب سے جوڑا جاتا ہے۔

(ب) تاریخی واقعات کو مخصوص مقاصد حاصل کرنے کے لیے غلط بیان کیا جاتا ہے۔

(ج) اپنے معاشرے کو عالمی معاشروں سے الگ تھلگ اور برتر بیان کیا جاتا ہے۔

(د) بتایا جاتا ہے کہ ہمارے زوال اور ہماری شکست کا سبب ہماری اپنی اندرونی کمزوری یا تضاد نہیں بلکہ دشمنوں کی ریشہ دوانی اور سازش ہے۔جس کی وجہ سے ہم خود تنقیدی کے تکلیف دہ عمل کے متوازن جائزے سے قاصر رہتے ہیں اور مستقبل کی منصوبہ بندی کے امکان گم کر دیتے ہیں۔

(ر) پروفیسر سیّد محمد نصیر کے مطابق ایسا نصاب ترتیب دیا جاتا ہے جس سے نوجوان ’’نہ کائنات کو سمجھ پائے اور نہ سماج کو۔ جب ان کو اپنے سوالات کا جواب نہیں مل پاتا۔ جب ان علوم کا ان کی زندگی سے ناطہ نہیں جڑ پاتا تو انہیں نصاب سے دلچسپی نہیں رہتی‘‘ وہ علم سے بے تعلقی اختیار کر لیتے ہیں۔

لوگوں کو غیر سیاسی بنانے کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ مقامی اسٹیبلشمنٹ اپنی پیدا کردہ غیر سیاسی قیادت کے ذریعے بادشاہوں کے طریقے سے حکومت کرتی ہے۔ عالمی سرمایہ داری کو

نجات دہندہ اور مشکل وقت کا دوست بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔

غیر سیاسی معاشرہ غلامی سے آزادی کے لیے ہمیشہ کسی معجزے کا منتظر رہتا ہے۔ کسی بھی غیر سیاسی نعرے اور کسی بھی شعبدہ باز کا وقتی پیروکار بن جاتا ہے۔ معاشرے کو تبدیل کرنے کے سیاسی عمل کا حصہ دار نہ بننے پر فخر محسوس کرتا ہے۔ ایسا معاشرہ جو عالمی انسانی معاشروں سے الگ تھلگ اور تنہا کر دیا جاتا ہے۔ وہ خود پسندی کا شکار ہو کر ماضی میں پناہ لینے پر روحانی سکون محسوس کرتا ہے۔

جرمن مفکر برتھولٹ بریخت نے ایسے غیر سیاسی معاشرے کے افراد کے بارے میں کہا ہے۔

The worst illiterate is the political illiterate, He does not hear, does not speak, nor participate in the political events. He does not know the cost of life, the price of bean, of the fish, of the flour, of the rent, of the shoes and of the medicine, all depend upon political decisions. The political illiterate is so stupid that he is proud and swells his chest saying that he hates politics. The imbecile does not know that, from his political ignorance is born, the prostitute, the abandoned child, and the worst thieves of all, the bad politician, corrupted and flunky of the national and multinational companies

Sanjh Lok Raj

تعلیمی پالیسیاں(2)

پاکستان کے تعلیمی پالیسیوں کو عالمی سرمایہ داری کی بدلتی ہوئی ضروریات کے تابع جس طرح تبدیل کیا جاتا رہا ہے اس لحاظ سے ہم ان تعلیمی پالیسیوں کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ یہ شواہد آپ کو ورلڈ بنک اور آئی ایم ایف کی رپورٹوں اور شرائط سے اکٹھے کرنے پڑیں گے۔ جن میں سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگراموں کی تفصیل اور عالمی سطح پر بلائی گئی تعلیمی کانفرنسیں بھی شامل ہیں۔

پہلا حصہ ان تعلیمی پالیسیوں پر مشتمل ہے جو سرمایہ داری نظام کے اندر رہتے ہوئے فلاحی ریاست کے قیام کے نظریئے کی مطابقت میں بنائی گئیں۔ یہاں پر سرمایہ داری کے فلاحی ریاست کے تصور کو تفصیل میں سمجھنا ضرری ہے۔

سرمایہ داری نظام معیشت چونکہ معاشرے کو دو واضح طبقوں میں تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک طرف ذرائع پیداوار کے مالک چند لوگ اور دوسری طرف محنت فروخت کر کے اپنی زندگی کو جاری رکھنے والے لوگوں کا سمندر۔ یہ سامنے نظر آنے والا ایک بہت بڑا تضاد ہے۔ اس سے لوگوں کے سمندر میں بے چینی اور محرومی کے احساسات پیدا ہوتے ہیں۔ سمندر میں بے چینی اور محرومی کا یہ احساس غصے میں تبدیل ہو کر انارکی پیدا کر سکتا ہے یا سیاسی طور پر منظّم ہو کر انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ جو سرمایہ داری نظام کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکے۔ اس خطرے کے پیش نظر سرمایہ داری نظام کے حامی مفکروں اور فلسفیوں نے دو حل سوچے۔

(ا) معاشرے کی معاشی نابرابری کے احساس پر ووٹ کا برابر حق دے کر حکومت منتخب کرنے کی سیاسی برابری کے احساس کو غالب کیا جائے۔

(2) لوگوں سے اکٹھے کیے گئے ٹیکسوں کی رقم کو لوگوں کے مجموعی معیار زندگی کو بہتر

Sanjh Lok Raj

بنانے کے لیے صرف کیا جائے۔ لوگوں کو مفت تعلیم، مفت علاج، روزگار کی ضمانت بڑھاپے کی پنشن۔ رہائش اور قیمتوں پر ریاستی کنٹرول کے ذریعے سستی اشیاء کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے اسے فلاحی ریاست کہتے ہیں۔

اس تصور کو (Keynesian welfare state) کہتے ہیں۔ فلاحی ریاست کا تصور تب تک قائم رہا جب تک دنیا میں سوشلسٹ بلاک موجود رہا۔ پاکستان کے لیے یہ عرصہ 1947ء سے 1990ء تک کا ہے۔ جس میں تین باقاعدہ تعلیمی پالیسیاں نافذ کی گئیں۔ پہلی فیلڈ مارشل ایوب پالیسی اور تیسری ضیاء الحق کی 1979ء کی تعلیمی پالیسی۔ ان پالیسیوں میں اپنے شہریوں کو تعلیم دینے کے لیے ریاست کی ذمہ داری کو تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ کوئی ریاست تب تک ترقی یافتہ نہیں کہلاسکتی جب تک اس کی بڑی آبادی تعلیم یافتہ نہ ہو۔ ''تعلیمی پالیسی'' کا تصور ہی فلاحی ریاست کی سرگرمیوں کا ایک اہم حصہ ہے۔

دوسرا حصہ ان تعلیمی پالیسیوں پر مشتمل ہے۔ جن کا تعلق اس دور سے ہے جب سوشلسٹ بلاک ختم ہو جانے کے بعد عالمی سرمایہ داری نیولبرل ازم کے مرحلے میں داخل ہو گئی تو ریاست کو عوامی فلاح و بہبود کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا گیا۔ جدید سامراجی نظریئے کے مطابق سماجی خدمات (صحت و تعلیم) فراہم کرنا ریاست کا نہیں نجی شعبے کا کام ہے۔ اس تبدیلی کو (Keynesian welfare state) سے (Schumpeterian work fare state) میں تبدیل ہونا کہا جاتا ہے۔

ویلفیئر کی بجائے ورک فیئر سے مطلب ہے (work for your welfare) یہ مرحلہ بظاہر تو 1990ء سے شروع ہوا نظر آتا ہے۔ مگر پاکستان میں اس کی بنیادیں ضیاء الحق کے مارشل لاء کے دوران رکھی گئیں۔ اس مرحلے پر یہ بات یاد رہے کہ مارشل لاء ہمیشہ عالمی معاشی ایجنڈے کو نافذ کرنے کے لیے لایا جاتا ہے۔ اس معاشی نظام کو ہم پر زبردستی مسلط رکھنے کے لیے ایک سیاسی نظام تشکیل دیا جاتا ہے اور تعلیمی پالیسی کو ان مقاصد کے پورا کرنے کے لیے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔

Sanjh Lok Raj

1 شریف کمیشن رپورٹ اور 1959ء کی تعلیمی پالیسی۔

یہ دور سرمایہ داری کی بالکل ابتدائی شکل کی پیدائش کا دور تھا۔ ایسا سرمایہ دار طبقہ پیدا کیا جانا تھا جس کی صنعت کے خام مال کا انحصار کسان اور جاگیردار پر ہو اور اس کی بنائی ہوئی مصنوعات کی سرمایہ دار ملکوں کی درآمدات سے ٹکر نہ ہو۔ جیسے (شوگر، گھی، کپاس، ٹیکسٹائل، اون، تمباکو، کاغذ، فلور ملیں، مشروبات، ماہی گیری اور دھات سازی)۔ ایوب خان کے دور کے 22 خاندان ایسی ہی صنعت کے مالک تھے ایسی معاشی بنیادیں رکھنے کے لیے جو تعلیم درکار تھی وہ تکنیکی اور فنی تعلیم تھی۔

1959ء میں سیکرٹری وزارت تعلیم (بیوروکریٹ) کی سرکردگی میں ایک تعلیمی کمیشن تشکیل دیا گیا جس میں صنعت وتجارت کی مشہور شخصیات کے علاوہ فوج کے اعلیٰ افسران بھی شامل تھے۔ کمیشن کی رپورٹ بنانے میں امریکہ اور برطانیہ کے ماہرین کی خدمات حاصل کی گئیں فورڈ فاؤنڈیشن، کارنیگی انسٹیٹیوٹ، کمیبرج، انڈیانا اور کولمبیا یونیورسٹی کے ماہرین نے اسے مرتب کیا۔

اس تعلیمی پالیسی کا سب سے بڑا تضاد بھی جدیدیت اور قدامت کا تضاد تھا جہاں تکنیکی اور فنی تعلیم کا انحصار سائنس سے لیے گئے تصورات پر تھا وہاں قوم کی تشکیل اور کردار کی تعمیر کے لیے مذہب کا سہارا لیا گیا۔ طے کیا گیا کہ لسانیات فرقہ واریت اور علاقائی شناخت ختم کر کے مذہب کے حوالے سے اپنی شناخت کروائیں۔

☆ طلبا کا سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینا غلط قرار دیا گیا۔

☆ فلزیات (Metallurgy) علم المعدنیات (Minerology) سفالیت (Ceramics) اور پٹرولیم جیسے نئے مضامین جن کا تعلق مقامی ذرائع سے ہو متعارف کرایا گیا۔

☆ زرعی تعلیم میں تحقیق اور تدریس کے کاموں میں مطابقت کے لیے ایک کونسل کی تشکیل کی سفارش کی گئی۔

☆ قانون اور کامرس کی تعلیم میں اصلاحات متعارف کروائی گئیں۔

Sanjh Lok Raj

1972 کی تعلیمی پالیسی

1970 کے عام انتخابات میں مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ نے قطعی اکثریت حاصل کی۔ مغربی پاکستان کے صوبہ پنجاب اور سندھ میں پاکستان پیپلز پارٹی جبکہ سرحد اور بلوچستان میں عوامی نیشنل پارٹی نے بڑی اکثریت حاصل کی۔ تینوں پارٹیوں کا انتخابی منشور سوشلزم تھا۔ اس سے آپ کو بخوبی اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مارشل لاء کے خاتمے کے لیے چلنے والی احتجاجی تحریک کے مطالبے کیا رہے ہوں گے۔ طلبا اس تحریک کا ہراول دستہ تھے۔ مارشل لاء کے خلاف چلنے والی تحریک کے مطالبوں کی جھلک آپ کو 1972ء کی تعلیمی پالیسی میں نظر آتی ہے اس پالیسی کا کلیدی پہلو پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو قومی تحویل میں لینا اور ہر شہری کو تعلیم دینا ریاست کی ذمہ داری قرار دینا تھا۔

- ☆ سب کے لیے لازمی ابتدائی تعلیم اور بہت بڑے پیمانے پر تعلیم بالغاں کے پروگرام شروع کر کے کم سے کم وقت میں ناخواندگی کا خاتمہ کرنا۔
- ☆ خواتین، معاشرتی حقوق سے محروم اور پسماندہ علاقوں کے بالغ افراد کو خصوصی سہولتیں دے کر انکو تعلیم تک رسائی بہم پہنچانا۔
- ☆ تعلیمی امور میں اساتذہ، طلباء، والدین اور عوام کی شرکت کو یقینی بنانا
- ☆ بدنام زمانہ یونیورسٹی آرڈیننس کی جگہ جامعات کے کاموں کو جمہوری بنانے کے لیے قوانین کا اجراء۔
- ☆ زرعی یونیوسٹی میں زیادہ شعبہ جات کھولنے اور میڈیکل کالجوں میں اضافہ کرنے کا فیصلہ 6 نئی جامعات کھولی گئیں۔ نواب شاہ اور ٹیکسلا میں انجینئرنگ کالج کھولے گئے۔

1979 کی تعلیمی پالیسی

پیپلز پارٹی کی حکومت کے دوران معاشرہ سیاسی ہوتا جا رہا تھا۔ ملک کی تعلیمی پالیسی بنانے کے لیے طلبا و اساتذہ کی شریک کا عندیہ دیا گیا تھا۔ اس دور میں یونیورسٹی کے اداروں میں اساتذہ و طلبا کو نمائندگی ملی اور اعلیٰ تعلیمی اداروں میں جمہوری روایت پنپنے لگیں۔ ''جہاں

Sanjh Lok Raj

تک تعلیم کا مقاصد کا تعلق ہے چوتھے پنج سالہ منصوبے (1970-1975ء) میں یہ حکمت علمی اختیار کی گئی کہ روایتی تعلیم کے فروغ پر پابندی لگائی جائے اور نظام تعلیم کو ترقی پذیر معیشت کے لیے مستقبل کی ضروریات کی خاطر زیادہ فعال بنایا جائے۔ تعلیم اور فنی تربیت کا ایسا نظام وضع کیا جائے جس میں مالی لحاظ سے وسائل کی منصفانہ تقسیم جھلکتی ہو۔'' (پاکستان میں اعلیٰ تعلیم، ڈاکٹر کیپٹن عثمان علی عیسانی)

پیپلز پارٹی کے اس دور کی معاشی پالیسیوں سے امریکہ ناخوش تھا۔ بھٹو کی پاکستان میں روس کے ذریعے صنعتکاری کروانے کی پالیسیوں سے امریکہ کو پہنچنے والے نقصان کا ازالہ کرنے پاکستان کی معاشی و سیاسی آزادی اور خودمختاری کی طرف اُٹھائے گیے چند اقدام کو واپس کرنے اور پاکستان کو دوبارہ عالمی سرمایہ داری کی غلامی میں دینے کا فریضہ سرانجام دینے کے لیے 5 جولائی 1977ء کو جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا۔ اکتوبر 1977ء ہی میں ایک قومی تعلیمی کانفرنس بلائی گئی تاکہ وہ ان مقاصد کے لیے تعلیمی پالیسی مرتب کرے۔ جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ جو کہ فروری 1979ء میں سفارشات مرتب کرنے میں کامیاب ہوئی۔ یہ دور معاشی اصطلاحات میں پرائیویٹائزیشن اور ڈی ریگولیشن کا دور کہلاتا ہے۔ ان معاشی اصطلاحات کو تعلیمی نظام میں متعارف کروانے کا نام اسلامائزیشن رکھا گیا۔

Privatization	Increased role of the private sector in providing all types of goods and services, transfar of ownership and manegment of public enterprise to private compaies.
Deregulation	A general withdwal of the state from providing control or oversight over economic and finanical transaction, the removal of all government interventions that might effect the free functioning of the market. e.g. removal of price control and goods and services dismantling of public subsidies etc.

Sanjh Lok Raj

Liberalization	giving up domestic contral over esential sections such as trade, finance, permitting foreign companions to own key enterprises such as banks easing controls on foreign investmentand and capital reducing trade traiff, duties and restrictuions etc.

اس تعلیمی پالیسی کا بنیادی مقصد تعلیم کو غیر پیداواری بنانا اور معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کے لیے استعمال کرنا تھا تاکہ عالمی سرمایہ داری کے ایجنڈے پر عملدارآمد میں رکاوٹ پیش نہ آئے۔ مدرسوں کی شکل میں متوازی تعلیمی نظام پیدا کیا گیا۔ دینی مدراس کے فارغ التحصیل طلبا کو ملازمت کے حصول کے قابل بنانے کے لیے دینی مدراس کی اسناد کو ایم۔اے کے مساوی تسلیم کیا گیا۔ پچھلی حکومت کی قومیانے کی پالیسی کو ترک کر دیا گیا۔نجی شعبہ کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

1979ء میں جامعات کے اخراجات کی ذمہ داری صوبوں کی بجائے مرکزی حکومت نے اپنے ذمہ لے لی تاکہ تعلیم میں مرکزیت قائم کر کے مقاصد تعلیم جو عسکریت کے لیے فائدہ مند تھے۔ان کی نگرانی کی جائے۔طلباء اساتذہ کو کنٹرول میں رکھا جائے۔حکومتی سطح پر جامعات قائم کرنے پر پابندی رہی مگر پرائیوٹ شعبہ میں آغا خاں یونیورسٹی 1983ء میں قائم کی گئی۔

’’پاکستان میں تعلیم، پالیسیاں اور پالیسی سازی‘‘ کے مصنف ڈاکٹر پرویز اسلم شامی نے 1979ء کی تعلیمی پالیسی کے مقاصد کو یوں بیان کیا ہے۔

☆ قرآن وسنت کے قوانین کے مطابق نوجوانوں کے کردار کی تعمیر۔

☆ طلبا میں یہ شعور بیدار کرنا کہ وہ صرف پاکستانی مسلمان ہی نہیں بلکہ اُمت مسلمہ کا حصہ ہیں۔

☆ سائنس اور سماجی سائنس کے تمام تر نصاب کو اسلامی تعلیمات میں ڈھالنا۔

کسی بھی ملک کی جمہوریت کو مستحکم کرنے کے لیے طلبہ کا سیاست میں حصہ لینا ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ طلباء تنظیمیں طلبا حقوق کے لیے صرف سیاسی سرگرمیوں ہی میں حصہ نہیں لیتی تھی بلکہ طلباء کے لیے تقریری مقابلے۔ مشاعرے تعلیمی

Sanjh Lok Raj

کانفرنسیں۔ کلچرل پروگرام۔ مصوری کے مقابلے، مضمون نویسی، کالج میگزین الغرض زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تربیت گاہیں تھیں۔ ضیاء الحق نے طلبا تنظیموں پر پابندی لگانے کے علاوہ فنون لطیفہ کی مختلف جہتوں پر ریاستی ہتھکنڈوں کے ذریعے مذہبی روایات کی آڑ میں پابندی کو جواز بنا کر معاشرے کو انتہا پسندی اور مذہبی جنونیت میں ڈھالنے کی بنیادیں رکھ دیں۔

تعلیم پرائیویٹائزیشن، لبرلائزیشن اور ڈی ریگولیس لاگو کر کے تعلیمی نظام کو عالمی سامراجی ایجنڈے کے تابع کر دیا۔

اگست 1988ء کو جنرل ضیاء الحق کا دور ختم ہو گیا تب سے 1999ء تک مختلف سول حکومتیں لائی جاتی رہیں۔ یہ حکومتیں اتنی بے بس تھیں کہ نہ خارجہ پالیسی بنانا انکے بس میں تھا اور نہ تعلیمی پالیسی کو چھیڑنا ان کے اختیار میں۔ حکومت تو انہیں مل گئی مگر اقتدار کبھی نہیں ملا۔ تعلیمی پالیسیاں اگرچہ بنائی تو گئیں مگر محض چند لفظوں کا رد و بدل تھا کیونکہ تعلیمی پالیسی پر اختیار نظریاتی سرحدوں کے محافظوں کے پاس تھا۔ 1992ء اور 1998ء کی تعلیمی پالیسیاں عالمی بنک کے سٹرکچرل ایڈجسٹمنٹ پروگراموں کے تحت بنائی گئی تھیں۔

نیولبرل ازم اور اعلیٰ تعلیم

1999 تک عالمی سرمایہ داری گلوبلائزیشن اور نیولبرل ازم کے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ پاکستان کے معاشی ڈھانچے کو اس نئے نظام سے ہم آہنگ کرنے کے لیے فوجی آپریشن کی ضرورت تھی۔ فری مارکیٹ اکانومی میں غیر ملکی سستی اشیاء کی بلا روک ٹوک فراہمی ایسے ملکوں کی صنعتوں کو برباد کر دیتی ہے جس کی معیشت کو حفاظتی قوانین کا تحفظ حاصل نہ ہو۔ چھوٹی موٹی صنعتوں کے مالک غیر ملکی سستی مصنوعات کے سیلاب میں ڈوب جاتے ہیں۔ اس لیے یہ چھوٹے صنعتکار اقتدار میں شریک ہو کر حکومتوں کو ایسی یلغار کو روکنے پر مجبور کرتے ہیں۔ ایسے لوگ 1999ء میں نواز حکومت میں بھی تھے۔ یعنی یہ قومی سرمایہ دار تو نہیں تھے مگر ان کے رجحانات قومی سرمایہ داری کے تھے۔ قومی سرمایہ داری کے رجحانات فری مارکیٹ اکانومی اور نیولبرل ایجنڈے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔ اس سے قبل پرائیویٹائزیشن کے ذریعے صنعتیں جب اصل مالکوں کو واپس کی جا رہی تھیں یا پاکستان ہی کے سرمایہ کاروں کو فروخت کی

Sanjh Lok Raj

جا رہی تھیں ان سے قومی سرمایہ داری کے رجحانات رکھنے والے لوگوں کی تعداد میں اضافہ ہوا تھا۔ نیولبرل ایجنڈے میں اس کا حل یہ سوچا گیا کہ پاکستان میں پرائیویٹائزیشن تو ہو مگر منافع بخش کارپوریشنیں یا صنعتیں ملٹی نیشنل کمپنیوں یا غیر ملکی سرمایہ کاروں کو فروخت کی جائیں (جیسے PTCL اور KESC کی پرائیوٹائیزشن ہوئی) یہ کام سول حکومت سے ہونا مشکل تھا اس کے لیے فوجی حکومت کی ضرورت تھی۔

اس پس منظر میں پرویز مشرف نے حکومت پر قبضہ کر لیا۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ نیولبرل ایجنڈہ کیا ہے اور اس کو تعلیم میں کیسے لاگو کیا گیا ہے۔ پہلے ہم ان کے اپنے الفاظ میں اسے دیکھتے ہیں۔ نیولبرل ازم کا مطلب ہے کہ کبھی بھی کہیں بھی سرکاری سکول نہیں کھلے گا۔

Neoliberalism proposes that market competition should be the organizing principle of ever more areas of life, from the production of cars to delivery of health services and education, a policy which requires stripping the state of "excessive involvement" in the economy and in soicety.

نیولبرل ازم کے مفکر جانسٹن کے مطابق تعلیم اور صحت کی سہولتیں فراہم کرنا ریاست کا نہیں نجی شعبہ کا فریضہ ہے۔ تعلیم اور صحت کی فراہمی کو مارکیٹ کے قواعد کے تابع لایا جائے اس سے تعلیم فراہم کرنے والے تعلیمی تجارتی اداروں میں مقابلے کا رجحان بڑھے گا اور اس سے تعلیم ترقی کرے گی۔ جو جتنی بہتر تعلیم مہیا کرے گا اپنی پراڈکٹ کی قیمت خود مقرر کرے گا ریاست اس میں مداخلت نہیں کر سکتی۔ یہ ایجنڈا فی الحال اعلیٰ تعلیم پر لاگو ہوگا۔

مشرف دور کی ابتدائی وزیر تعلیم زبیدہ جلال نے پبلک پرائیویٹ، پارٹنرشپ کے تحت غیر سرکاری تعلیمی بورڈ کے قیام کی اجازت بھی دے دی اور کہا کہ ملک بھر میں جو تعلیمی بورڈ پبلک سیکٹر میں قائم ہیں وہ تعلیم کے معیار کو معینہ سطح پر لے جانے میں قطعاً ناکام رہے اور یہ کہ یہ تمام بورڈ امتحانی نظام کے حوالے سے روایتی انداز کے حامل اور یکسانیت کا شکار ہو گئے ہیں۔

اس لیے معیار تعلیم کو مطلوبہ سطح پر لانے۔ ملک میں امتحانات کے نظام کو مؤثر بنانے۔ مسابقتی اور افادی بنانے کے لیے نجی شعبہ میں تعلیمی بورڈ کا قیام ناگزیر ہو گیا ہے۔ نجی شعبہ میں تعلیمی بورڈ قائم ہونے سے پبلک سیکٹر کے ساتھ اس کی صحت مند مسابقت ہو جائے گی

Sanjh Lok Raj

اس طرح پورے ملک میں صحت مند تعلیمی ماحول پروان چڑھے گا۔

2000 میں یونیسکو۔ یونیسف ۔ UNDP اور عالمی بنک کے زیر اہتمام عالمی تعلیمی فورم منعقد کیا گیا۔ جس میں 182 ملکوں کے نمائندے شامل ہوئے۔ جس میں اقوام متحدہ کے ادارے UNDP کی طرف سے 2015ء تک کے لیے (Millenium Development Goals) میں ایک طے شدہ عالمی پروگرام سب کے لیے تعلیم (Education for all) پر عملدرآمد کے لیے ان ممالک سے دستخط لیے گئے اور ان ممالک کی امداد کو (EFA) کے ہدف کو حاصل کرنے سے مشروط کر دیا گیا۔ یہ کانفرنس ڈاکار (سینیگال) میں منعقد ہوئی۔ لیکن یہ ہدف پرائمری ایجوکیشن تک محدود تھا جبکہ ہائر ایجوکیشن کو نیولبرل ایجنڈا کے تحت تجارت کا مال بنا کر مارکیٹ میں پیش کرنا تھا۔

پاکستان میں 29 اپریل 2001ء کو ایک ٹاسک فورس بنائی گئی جس میں 117 ارکان بطور ارکان شامل ہوئے جب کہ لاہور یونیورسٹی برائے مینجمنٹ سائنسز اور آغا خان یونیورسٹی کے منتظمین کو اس فورس کا مشترکہ طور پر چیئرمین بنایا گیا تا کہ وہ اعلیٰ تعلیم کی صورت حال کا جائزہ لے کر اس کی بہتری کے لیے ٹھوس اقدامات تجویز کریں۔ ٹاسک فورس نے سفارش مرتب کی کہ ملک کی جامعات کو تعلیمی، انتظامی اور مالیاتی معاملات چلانے کے لیے ریاست کے اثر سے آزاد تنظیم ہونی چاہیے۔ برطانیہ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے قائم فنڈنگ کونسل کے اصول پر کمیشن برائے اعلیٰ نظام تعلیم قائم کیا جانا چاہیے۔ ان سفارشات کی روشنی میں ہائر ایجوکیشن کمیشن برائے تعلیم قائم کیا گیا۔ جو (HEC) کہلاتا ہے۔

مشرف حکومت نے (EFA) کی فنڈنگ کو پڑھا لکھا پنجاب میں تبدیل کر دیا جبکہ اعلیٰ تعلیم کے لیے نجی شعبہ میں لاتعداد یونیورسٹیوں کے قیام کے چارٹر جاری کیے۔ اور تعلیم کو نیولبرل ایجنڈے کے تحت مارکیٹ قوتوں کے حوالے کر دیا۔

تعلیمی پالیسی 2009ء۔

چونکہ پاکستان پیپلز پارٹی اپنے پہلے دور حکومت میں 1972 میں ایک جامع تعلیمی پالیسی دے چکی تھی اور 1973ء کے آئین میں بھی آرٹیکل 37-B کے ذریعے سیکنڈری سطح

Sanjh Lok Raj

تک کی مفت اور لازم تعلیم کی ذمہ داری ریاست پر ڈال چکی تھی اس لیے (EFA) کا ''تعلیم سب کے لیے'' کا پروگرام پیپلز پارٹی کے منشور کو تقویت دیتا تھا۔ لیکن وہ دور ویلفیئر ریاست کا دور تھا۔ 2009ء تک عالمی سرمایہ داری نیو لبرل ازم تک آ چکی تھی اس لیے پیپلز پارٹی نے 2009ء جو تعلیمی پالیسی پیش کی وہ اگرچہ نیو لبرل ایجنڈے ہی کا حصہ تھی مگر اس میں پبلک سیکٹر کو مضبوط کرنے کا عندیہ دیا گیا ہے۔

☆ ہر شہری کو تعلیم دینا اگرچہ ریاست کا فریضہ ہے۔ مگر ریاست کے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں ناکامی کے باعث پرائیویٹ سیکٹر اُبھر کر سامنے آ گیا۔ موجودہ حالت میں پبلک، پرائیویٹ پارٹنر شپ تعلیمی ماحول میں بہتری لانے میں مددگار ثابت ہو گی۔

☆ پاکستان اپنی عالمی کمٹمنٹ پر پورا اُترے گا اور عالمگیریت کے چیلنج پر پورا اُترنے کی کوشش کرے گا۔ (MDGs) اور (EFA) کے ہدف کو پورا کرے گا۔

☆ اس ٹارگٹ کو پورا کرنے کے لیے تعلیم کے لیے (GDP) کا 7 فیصد بجٹ مختص کرنے کی سفارش بھی کی گئی۔

ایک ہی سال بعد قومی اسمبلی نے 18ویں آئینی ترمیم منظور کر لی۔ اور تعلیم اب صوبائی حکومتوں کے اختیار میں دیتے ہوئے آرٹیکل 25-A کے تحت 5 سال سے 16 سال کے بچے کا تعلیم پر حق تسلیم کرتے ہوئے ریاست پر تعلیم کی ذمہ داری ڈال دی۔ صوبائی حکومتوں نے اس ترمیم کے تحت اپنے اپنے صوبے میں جو نئی قانون سازی کرنی تھی۔ وہ یہ تھی کہ

☆ صوبائی سطح پر قانونی اور انتظامی ڈھانچے کو اس ترمیم کی مطابقت میں تشکیل دینا۔

☆ نئی پالیسی، نصاب۔ امتحانات اور تعلیمی معیار کو ترتیب دینا تھا۔

☆ اخراجات کی کمی و دیگر رکاوٹوں کو دور کرنا تھا۔

مگر کچھ نہیں ہوا۔ اس اثناء میں 2013ء کے الیکشن آ گئے تمام سیاسی پارٹیوں نے اپنے اپنے منشور میں تعلیم کو اہمیت ضرور دی۔ یہ منشور انتخابات سے پہلے کی ایک رسم ضرور ہوتے ہیں مگر برسر اقتدار آنے والی پارٹی اسی تعلیمی منشور پر عمل کرتی ہے جو انہیں کشکول بھرنے والوں کی طرف سے تجویز کیا جاتا ہے۔ پھر یہ کام منشور نہیں کرتا بیورو کریسی کے سپرد کیا جاتا ہے۔

Sanjh Lok Raj

انتخابی منشور مسلم لیگ (ن) میں تعلیم

اقتدار میں آنے کے بعد ''قومی تعلیمی ایمرجنسی'' کا اعلان کیا جائے گا تا کہ جہالت کو جنگی بنیادوں پر ختم کرنے کی کوشش کی جا سکے۔ صوبوں سے مشاورت کے بعد ایسی قانون سازی کی جائے گی جس کے نتیجے میں 2015ء تک جو ملینیئم ترقیاتی اہداف حاصل کیے جانے ہیں۔ ان کی طرف بڑھا جا سکے۔ مڈل کی سطح تک سو فیصد انرولمنٹ کو یقینی بنایا جا سکے گا اور 80 فیصد خواندگی کا ہدف بھی حاصل کیا جا سکے گا۔ مسلم لیگ (ن) ملک میں یکساں نظام تعلیم متعارف کروائے گی اور اس بات کا اہتمام کرے گی کہ پرائمری سکولوں کی سطح پر تعلیم ترک کرنے والوں کا تناسب کم کیا جا سکے ایسا کرنے کے لیے وہ بچوں کو مفت کتابیں فراہم کرے گی۔

منشور یہ بھی کہتا ہے کہ سائنس کی تعلیم کو بہتر سے بہتر بنانے اور سائنس کی لیبارٹریوں کو بہتر بنانے کے لیے فنڈ فراہم کئے جائیں گے۔ ایک ٹیکنالوجی ڈویلپمنٹ فنڈ بھی قائم کیا جائے گا۔ جس کی مدد سے باہر کے ملکوں سے پی ایچ۔ ڈی کر کے واپس آنے والے پاکستانی طلبا نئی ٹیکنالوجی کو پاکستان میں متعارف کروانے کا فریضہ سرانجام دے سکیں گے۔ دینی مدارس کو مالی امداد کے ذریعے مرکزی تعلیمی دھارے میں شامل کیا جائے گا۔

اس کے برعکس مسلم لیگ ن جب بھی برسرِ اقتدار آئی عملاً اس نے تعلیم کی خفیہ پرائیویٹائزیشن کا عمل جاری رکھا۔

پاکستان پیپلز پارٹی کا منشور (2013ء) اور تعلیم

☆ تعلیم اب چونکہ صوبائی مضمون بن چکی ہے لہٰذا مرکزی حکومت صوبوں کو تعلیمی پروگرام اور تعلیم کے شعبے میں تعمیر و ترقی کے لیے بھرپور امداد فراہم کرے گی۔ تعلیم پر GDP کا 4.5٪ تک خرچ کیا جائے گا۔ تعلیم کو بامعنی اور صحتمند بنانے کے لیے نصاب کی اصلاح کی جائے گی اس میں اسے عداوت اور نفرت پر مبنی مواد خارج کر دیا جائے گا۔ پیپلز پارٹی کی حکومت ایک 'نیشنل ایجوکیشن اسٹینڈرڈ کونسل' قائم کرے گی۔ نجی اور سرکاری سکولوں کے درمیان پائے جانے والے فاصلے کو کم کیا جائے گا۔

☆ تعلیمی اصلاحات کے ذریعے پاکستانی معاشرے میں طبقاتی تقسیم، صنفی نابرابری،

غربت اور بے روزگاری کو ختم کیا جا سکتا ہے۔تعلیم کا فروغ رجعت پسندی کا خاتمہ کرنے اور ایک ایسے مستقبل بیں نقطہ نظر کی نمو کا ذریعہ بن سکتا ہے جو ہمارے معاشرے میں پائی جانے والی مقامی ترقی پسند روایات، جدید سائنس اور آفاقی اقدار کی ہم آہنگی پر بنیاد رکھتا ہو۔

☆ تعلیم کیلیے مؤثر منصوبہ بندی اور بہتر بجٹ سازی کے ساتھ ایک ہمہ جہت طرز عمل کی ضرورت ہے تا کہ پورے تعلیمی نظام کو تبدیل کیا جا سکے۔ مادری زبان اور قومی اور بین الاقوامی زبانوں پر زور دیا جائے گا۔

☆ مدرسوں کو کونسلز بنا کر ان کے ذریعے دینی مدارس کے نصاب کی اصلاح اور ان کو جدید تعلیمی نظام میں ڈھالنے کا کام کیا جائے گا۔

پاکستان تحریک انصاف کا انتخابی منشور اور تعلیم

☆ ملک میں ایک ہی نظام تعلیم رائج ہونا چاہیے اور اس یکسانیت کے لیے وہ ذریعہ تعلیم کے طور پر اختیار کردہ زبان کو کلیدی اہمیت دیتی ہے۔اس کا خیال ہے کہ تمام سرکاری اور غیر سرکاری سکولوں میں آٹھویں جماعت تک اردو یا مقامی زبانوں کو ذریعہ تعلیم بنایا جانا چاہیے۔آٹھویں سے دسویں تک ایک عبوری دور ہوگا جس میں انگریزی ذریعہ تعلیم کی طرف سفر شروع کیا جائے گا بعد ازاں یونیورسٹی اور پیشہ وارانہ اداروں میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے گا۔

☆ تحریک انصاف اقتدار میں آنے کے بعد پانچ سال میں تعلیم پر خرچ ہونے والے (GDP) کے 2 فیصد سے بڑھا کر 5 فیصد کردے گی۔تحریک تعلیم کے پورے نظام کو عدم مرکزیت سے ہمکنار کرتے ہوئے خدمات کی ادائیگی کے شعبے کو ضلعوں کی سطح تک پہنچاوے گی۔

☆ سرکاری کالجوں کو جدید بنایا جائے گا اور علاقے کی کمیونٹی کو ادارے کے نظم ونسق میں شامل کیا جائے گا۔

☆ غریب طلباء کے لیے اعانت کا ذکر ہے اور ہنرمند افراد کو مختلف شعبوں میں کھپانے

Sanjh Lok Raj

اوران کے لیے ملازمت کے انتظام کی خاطر ایک سروس کے قیام کا بھی وعدہ کیا گیا ہے۔

متحدہ قومی موومنٹ کا منشور اور تعلیم

منشور کا پہلا باب ہی تعلیم کے موضوع پر رکھا ہے۔ ایم کیو ایم کا خیال ہے کہ معاشرتی ترقی کی بنیاد تعلیم پر استوار ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے بے روزگاری کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ معاشرتی مساوات کو یقینی بنایا جا سکتا ہے۔ لوگوں کے شعور میں اضافہ کیا جا سکتا ہے اور معاشرے میں برداشت کے رویے کو عام کیا جا سکتا ہے۔ متحدہ قومی موومنٹ بھی تعلیم پر GDP کا 5 فیصد خرچ کرنے کا عزم رکھتی ہے۔ صوبے میں مالیاتی بجٹ کا 20 فیصد تعلیم پر خرچ ہو سرکاری اردو میڈیم سکولوں کو ترقی دے کر نجی انگریزی سکولوں کی سطح تک لایا جائے۔ دینی مدارس کو مراعات کے ذریعے قومی اداروں کی صف میں ہونے کی ضرورت ہے۔

شرح خواندگی کو بہتر بنانے کے لیے کمیونٹی اور مقامی حکومت کی سطح پر اہم خدمات سرانجام دی جا سکتی ہیں۔ بچوں کو مفت کتابیں، سفری سہولیات فراہم کی جائیں۔

عوامی نیشنل پارٹی اور تعلیم

تعلیمی پروگرام کو ملک کے رجعت پسندانہ اقدار اور انتہا پسند کلچر سے نجات دینے کے مقصد پر تشکیل دیا جائے۔ کل قومی پیداوار کا 6 فیصد تعلیم پر مختص کیا جائے۔ اے این پی کے خیال میں ملک میں ایک سے زیادہ تعلیمی نظام چل رہے ہیں۔ جن کی وجہ سے طبقاتی نظام تعلیم کو مستحکم کیا گیا ہے اور فیوڈل طبقے کے مفادات کو تحفظ فراہم کیا گیا ہے۔ یکساں نظام تعلیم اس تضاد کو حل کرنے میں مدد دے گا اور پارٹی اس نظام کو عالمی معیارات کے مطابق ڈھالے گی۔ تعلیم کو بیوروکریسی کے تسلط سے آزاد کیا جائے گا۔ اس پارٹی کا منشور والدین اور اساتذہ پر مشتمل منتخب تنظیموں کے قیام کی بھی وکالت کرتا ہے۔

ANP نجی اداروں کو ڈی ریگولیشن پالیسی کے تحت فیسوں میں من مانی کرنے کے خلاف ہے وہ نجی اداروں کو قوانین اور ضابطوں کا پابند کرے گی۔ یونیورسٹیوں کو تحقیق کا مرکز بنایا جائے گا۔ تعلیم کے لیے مادری زبان کو ذریعہ بنایا جائے گا۔ اے این پی نوجوانوں کی

Sanjh Lok Raj

ملازمتوں کو یقینی بنانے کی کوشش کرے گی۔ نوا جوانوں کو تخلیقی شعبوں مثلاً آرٹ اور کلچر کی طرف بھی مائل کرے گی۔

بائیں بازو کی پارٹیاں اور تعلیم

پاکستان کی بائیں بازو کی پارٹیاں پاکستان میں پیداواری نظام تعلیم نافذ کرنا چاہتی ہیں ان کے نزدیک پاکستان میں پیدا ہونے والے ہر بچے کی تعلیم کی ذمہ داری ریاست پر ہے ۔خواہ وہ تعلیم پرائمری ہو۔ مڈل یا اعلیٰ تعلیم یا پھر پیشہ وارانہ تعلیم۔ مفت تعلیم اور تعلیمی سہولتیں ہر ایک کو فراہم کرنا حکومت کا کام ہے۔ اور ''سب کے لیے تعلیم کی'' بجائے ''سب کے لیے یکساں مواقع برائے تعلیم کا اصول اپنایا جائے گا۔ تعلیم اور صحت کے تمام تر اخراجات حکومت کی ذمہ داری'' ہوں گے۔ تعلیم کو معاشرے کی پیداواری تخلیقی صلاحیتیں اُبھارنے کا ذریعہ بنایا جائے گا۔ تعلیم کا ذریعہ مادری زبان ہو گی۔ تعلیم معاشرے میں سیاسی اور طبقاتی شعور پیدا کر کے غیر طبقاتی معاشرے کے قیام کا ذریعہ بنے گی۔

سرمایہ داری نظام اور تعلیمی پالیسیاں برائے پیریفرل ریاست نو آبادیاتی تعلیمی پالیسیاں اور آبادی کی بڑھتی ہوئی شرح میں ان پڑھ لوگوں کی تعداد میں اضافہ اس گوشوارے سے دیکھا جا سکتا ہے۔

ان پڑھتا millions (10+)	خواندگی Rate (10+)	آبادی Pop 10+mittions	سال
18.65	17.9	22.71	1951
22.08	16.7	26.12	1961
33.59	21.7	42.91	1972
42.69	26.2	56.33	1981
50.38	43.92	89.84	1998
50.40	55.00	112.00	2006-7

www.aserpakistan.org

Sanjh Lok Raj

روحانی تعلیم

''ڈاکٹر روبینہ سہگل نے قومیت، تعلیم اور شناخت کے نام سے اپنی کتاب میں ایک مدلل، سائنسی دلائل پر مبنی مؤقف پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارے نظام تعلیم کو مرتب کرنے کی منصوبہ بندی اس انداز سے کی گئی ہے کہ زندگی کے مختلف شعبوں کو ایک دوسرے الگ اور ایک دوسرے سے بے تعلق ثابت کیا جائے۔ ہم سمجھیں کہ علمی، ثقافتی اور معاشرتی مسائل کا سیاست، معیشت، ریاست اور بین الاقوامی امور سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ تعلیمی نظام کو بھی مختلف شعبوں میں بانٹ دیا گیا ہے۔ مثلاً اقتصادیات، تاریخ، نفسیات، سیاسیات اور ادب کے شعبوں کو علیحدہ جگہ علیحدہ طریقوں سے پڑھایا جاتا ہے اور ان کے درمیان انسانی جسم کے اعضا کے درمیانی آپسی تعلق کی طرح کا جو تعلق ہے اسے جان بوجھ کر نظروں سے اوجھل کر دیا جاتا ہے۔ اس سے یہ تصور جنم لیتا ہے کہ ایک شخص کی معاشی زندگی کا اس کے ملک کی سیاست یا اخلاقی قدروں، یا ادب، یا اس کی نفسیات سے کوئی رشتہ نہیں۔ اس کے علاوہ معاشرتی اور ادبی علوم کو سائنسی علوم سے جدا کر دیا گیا ہے۔ اس نظریہ کو جنم دیا گیا ہے کہ مادی دنیا کا روحانی دنیا سے کوئی تعلق نہیں۔''

اس پر اضافہ یہ کہ پاکستان نے نظریاتی سرحدوں کے محافظوں کی سرپرستی میں تاریخ کے اُلٹ چلنے اور وقت کے اشاروں کو نہ سمجھنے کا تہیہ کر لیا ہے۔ آج یہ ثابت ہو گیا ہے کہ جو علم مادی ترقی نہیں دے سکتا وہ روح کی نشوونما کے لیے بھی بے کار ہوتا ہے۔ مادی ترقی کے بغیر معاشرہ روحانیت میں تو ترقی نہیں کر سکتا البتہ منافقت میں اس کا ثانی پیدا ہونا مشکل ہے۔

عالمی سرمایہ داری کی بدلتی ہوئی ضرورتوں کے مطابق پاکستان میں بدلتی ہوئی تعلیمی پالیسیاں۔

Sanjh Lok Raj

تجارتی سرمایہ داری 1066-1815	1781ء لارڈ وارن ہیسٹنگ نے کلکتہ میں عربی مدرسہ کھولا 1791ء جوناتھن ڈنکن نے بنارس میں سنسکرت سکول کھولا 1800 ویلسلے نے فورٹ ولیم کالج بنایا۔
صنعتی سرمایہ داری 1815-1900	1835ء غیر پیداواری نظام تعلیم، انگریزی زبان، تدریس کا حاکمیتی مادل
مالیاتی سرمایہ داری 1900-1939	1901 شملہ میں لارڈ کرزن نے پہلی آل انڈیا تعلیمی کانفرنس بلائی 1904 حرفتی تعلیم کا آغاز ہوا تاکہ ریلوے اور نہری نظام کے لیے انجینئر مزدور میسر ہوں

عالمی سرمایہ داری کا قیام۔سوشلسٹ بلاک کا مقالہ Keynesian تعلیمی پالیسیاں

عالمی سرمایہ داری اور ساختی مطابقت 1958-1990	1959 شریف کمیشن رپورٹ۔سرمایہ داری کی ابتداء اور سیکولر تعلیم 1972 تعلیم کا سوشلسٹ آئیڈیل مفت تعلیم، مفت سفر سہولتیں 1979 پرائیویٹائزیشن مدرسوں کے متوازی تعلیمی نظام کا قیام 1992 پرائیویٹائزیشن سوشل ایکشن پروگرام اور عالمی بنک کا تعلیم منصوبہ 1998 نجی شعبے کے تعاون سے صنعتی طریق کار کی بہتری کے لیے سائنسی تعلیم کی خواہش

سوشلسٹ بلاک کا خاتمہ۔عالمی سرمایہ داری کے نیولبرل فیز کی تعلیمی پالیسیاں

گلوبل سرمایہ داری اور نیولبرل ازم 1990-2009ء	2001ء پرائمری تعلیم میں (EFA) کا ہدف اور اعلیٰ تعلیم میں نیولرل ایجنڈے پر عملدرآمد 2009ء پبلک پرائیویٹ پارٹنرشپ۔ پبلک سیکٹر کو بہتر بنانے کا عندیہ 2010ء اٹھارہویں ترمیم اور تعلیم صوبوں کو منتقل

Sanjh Lok Raj

کتابیات

1	فلسفہ کیا ہے	اشفاق سلیم مرزا
2	مذہب سائنس اور فلسفہ	مشتاق احمد
3	انسان بڑا کیسے بنا	ایلن سیگال
4	تعلیم اور مظلوم عوام	پولوفرائرے
5	سائنس کی اعلیٰ تعلیم اور پاکستان	پروفیسر عطاء الرحمٰن
6	پاکستان میں سیاسی عدم استحکام کے تعلیم پر اثرات	ڈاکٹر محمد اشرف خرم
7	پاکستان میں اعلیٰ تعلیم	ڈاکٹر کیپٹن عثمان علی عیسانی
8	تعلیم، مسائل وافکار	ڈاکٹر سیّد جعفر احمد

Sanjh Lok Raj

عالم فاضل میرے بھائی
پا پڑھیاں میری عقل گوائی
(بُلّھے شاہ)

بُلھیا! اج وی پا پڑھیاں نے ساڈی عقل گوائی
مندے نہیں دلیلاں عقلوں باہر ایہہ گلاں کردے
سپ نہ ویکھن، لیہیاں کٹّن ایہہ رِیتاں دے بَردے
ایہناں اگے کُسک نہ سکیے کافر ہون توں ڈردے
ڈر دوزخ دا پُوری جاوے سوچاں دی ڈونگھیائی
بُلھیا! اج وی پا پڑھیاں نے ساڈی عقل گوائی
(صابر علی صابر)

Sanjh Lok Raj

بیک ٹائٹل

جب دنیا کے ہر گوشے میں زراعت ہی نظام معیشت تھی اور استعمال کی چیزیں ہاتھ سے بنائی جاتی تھیں تب ساری دنیا پر بادشاہی نظام مسلط تھا زرعی دور میں تعلیم کسی اتھارٹی کی قیاسی معلومات اور مجرد خیالات کو ذاتی طور پر جاننے کا نام ہوا کرتا تھا۔ تعلیم کاروبار زندگی چلانے سے لاتعلق ہوا کرتی تھی۔ تعلیم کسی شخص میں پہلے سے موجود ذاتی خوبیوں میں ایک خوبی کا اضافہ سمجھی جاتی تھی ایسی تعلیم کو زیور کا درجہ حاصل تھا۔

تعلیم کے بارے میں دوسرا نقطہ نظر یورپ میں صنعتی انقلاب نے پیدا کیا۔ جب ہر شے مشین سے بنائی جانے لگی۔ تعلیم پیداواری عمل کا لازمی حصہ بن گئی۔ معیشت کا انحصار تعلیم پر ہو گیا۔ سائنس اور ٹیکنالوجی نے دنیا کو تبدیل کرنے کا آغاز کیا۔ اب اگر آپ کمپیوٹر پر کام کر رہے ہیں یا گاڑی پر سفر کر رہے ہیں۔ دور دراز ملک میں کسی سے فون پر بات کر رہے ہیں یا گرمی سے بچنے کے لیے ایئر کینڈیشنڈ میں بیٹھے ہیں۔ آپ کے زیر استعمال ان سب چیزوں کو بنانے کے لیے الگ الگ علوم کی ضرورت ہے۔ اس طرح تعلیم اب زیور نہیں رہی تھی بلکہ پیداواری عمل کا لازمی حصہ بن گئی تھی۔

ہمارے ملک میں تعلیمی نظام کی بنیادیں برطانوی سامراج نے اپنے دو سو سالہ قبضے کے دوران رکھیں۔ انھوں نے ایسی تعلیم متعارف کروائی جو غیر پیداواری ہو اور معاشرے کو غیر سیاسی بنانے کے کام آئے۔ اسے کالونیل تعلیمی ڈھانچے کہتے ہیں۔ آج بھی ہمارے تعلیمی نظام کو کالونیل بنیادوں پر چلایا جا رہا ہے۔ تعلیم کے زیور سے آراستہ کیا جا رہا ہے مگر تعلیم کو پیداواری عمل کے ساتھ جوڑا نہیں جائے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ 67 سال کشکول اُٹھا کر گزار دیئے۔ اور اگر اب بھی تعلیمی نظام کو تبدیل نہ کیا گیا تو 1947ء میں معاشی غلامی کو برقرار رکھتے ہوئے ہم نے بزعم خود جو سیاسی آزادی حاصل کی تھی وہ سیاسی آزادی قرضوں میں گروی رکھی رہے گی۔

Sanjh Lok Raj